

# باقیات ہادی

مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی

ترتیب

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

سلسلہ مطبوعات (۵۰)

## BAQIYAT-E-HADI

By : Maulana Abdul Hadi ul Qadri Budauni

عنوان کتاب : باقیات ہادی  
نگارش : مولانا محمد عبد الہادی القادری بدایونی  
ترتیب : مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری  
طبع اول : دسمبر ۲۰۰۹ء / ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ

### برائے ایصال ثواب

محترم سید احتشام احمد رزاقی و محترمہ سیدہ شمیم فاطمہ رزاقی  
اورنگ آباد

<i>Distributor</i> <b>Maktaba Jam-e-Noor</b> 422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6	<i>Publisher</i> <b>Tajul Fuhood Academy</b> <b>Madrssa Alia Qadria,</b> Maulvi Mahalla, Budaun-243601 (U.P.) India Phone : 0091-9358563720
---	--

## انتساب

میری دادی اور حضرت ہادی کی والدہ

”بھابی اماں“

کے نام

جب وہ دنیا سے رخصت ہوئیں تو ان کا ”صندلی بیٹا“ (ہادی) صرف ۷ برس کا تھا۔

اسید الحق قادری

# جشن زریں

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے یہ نکلنے ہوئے سورج کی افق تابی ہے  
مارچ ۲۰۱۰ء میں تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ  
بدایوں شریف) کے عہد سجادگی کو پچاس سال مکمل ہونے جارہے ہیں، ان پچاس برسوں میں اپنے اکابر  
کے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے رشد و ہدایت، اصلاح و ارشاد، وابستگان کی دینی اور روحانی  
تربیت اور سلسلہ قادریہ کے فروغ کے لیے آپ کی جدوجہد اور خدمات محتاج بیان نہیں، آپ کے عہد  
سجادگی میں خانقاہ قادریہ نے تبلیغی، اشاعتی اور تعمیری میدانوں میں نمایاں ترقی کی، مدرسہ قادریہ کی نشاۃ  
ثانیہ، کتب خانہ قادریہ کی جدید کاری، مدرسہ قادریہ اور خانقاہ قادریہ میں جدید عمارتوں کی تعمیر، یہ سب  
ایسی نمایاں خدمات ہیں جو خانقاہ قادریہ کی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہیں۔

بعض وابستگان سلسلہ قادریہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر نہایت تزک و احتشام سے ”پچاس  
سالہ جشن“ منایا جائے، لیکن صاحبزادہ گرامی قدر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری (ولی عہد خانقاہ قادریہ  
بدایوں) نے فرمایا کہ ”اس جشن کو ہم ’جشن اشاعت‘ کے طور پر منائیں گے۔ اس موقع پر اکابر خانوادہ  
قادریہ اور علماء مدرسہ قادریہ کی پچاس کتابیں جدید آب و تاب اور موجودہ تحقیقی و اشاعتی معیار کے مطابق  
شائع کی جائیں گی، تاکہ یہ پچاس سالہ جشن یادگار بن جائے اور آستانہ قادریہ کی اشاعتی خدمات کی  
تاریخ میں یہ جشن ایک سنگ میل ثابت ہو“۔ لہذا حضور صاحب سجادہ کی اجازت و سرپرستی اور صاحبزادہ  
گرامی کی نگرانی میں تاریخ ساز اشاعتی منصوبہ ترتیب دیا گیا اور اللہ کے بھروسے پر کام کا آغاز کر دیا گیا،  
اس اشاعتی منصوبے کے تحت گزشتہ ۲ سال سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، زیر نظر کتاب اسی  
سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

رب قدیر و مقتدر سے دعا ہے کہ حضرت صاحب سجادہ (آستانہ قادریہ بدایوں) کی عمر میں برکتیں عطا  
فرمائے، آپ کا سایہ ہم وابستگان کے سر پر تادیر قائم رکھے۔ تاج الفحول اکیڈمی کے اس اشاعتی منصوبے کو  
بحسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچائے اور ہمیں خدمت دین کا مزید حوصلہ اور توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**عبدالقیوم قادری**

جنرل سکریٹری تاج الفحول اکیڈمی

خادم خانقاہ قادریہ بدایوں شریف

# فہرست مضمولات

شمار	عنوان	صفحہ
☆	<b>مضامین ہادی</b>	
۱۔	استاذ الاساتذہ (مفتی اکرام احمد لطف بدایونی کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ)	16
۲۔	عمید اور عیدی (حضرت عاشق الرسول کے وصال پر ایک تاثراتی تحریر)	30
۳۔	رغم الانف (ڈاکٹر مسعود احمد نقشبندی کے ایک رسالہ کا تنقیدی جائزہ)	37
۴۔	عرب اور سفارت	51
۵۔	عربوں کا فن حرب	57
۶۔	کتا اور عرب (قدیم عربی معاشرہ اور ادب میں کتے کے بارے میں عربوں کا نظریہ)	62
۷۔	تلواروں کی چھاؤں میں (عرب شعرا کی بدیہہ گوئی)	69
۸۔	دھوپ چھاؤں (امرا کے عروج و زوال کی داستانِ عبرت)	74
۹۔	خطیب اور خطبہ	81
☆	<b>مکاتیب ہادی</b>	
۱۔	مکاتیب بنام حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری	90
۲۔	بنام حضرت عبدالمجید اقبال قادری	97
۳۔	بنام مفتی عزیز احمد قادری بدایونی	101
۴۔	بنام ڈاکٹر اسعد بدایونی	108
۵۔	بنام ہشیرہ (بیگم خواجہ احتشام الدین قادری)	114
۶۔	بنام سید عبدالملوکی قادری بریلوی	116
۷۔	بنام مولانا سید معین الدین قادری جیلانی	118
۸۔	بنام مرتب (اسید الحق محمد عاصم قادری)	120
☆	<b>فغان ہادی (حصہ نظم)</b>	
۱۔	سقانی الحب کاسات الوصالی (تشطیر الحمیریہ)	122
۲۔	آمی لا تظن ان ادین (علی نہج عمرو)	125
۳۔	حاملوا المجد ناطقون بضاد (بنی العروبة)	127
۴۔	بائس انی غریب سائل نحوک اسیر	129

- ۱۳۰ - ۵۔ یا صاحب الجود و الاحسان والکرم
- ۱۳۱ - ۶۔ انت الفرید بحسنتک وجمالک
- ۱۳۲ - ۷۔ ہذا بیت اللہ بالوادی الامین
- ۱۳۳ - ۸۔ شیخ خبیر بالکتاب وما بہ
- ۱۳۴ - ۹۔ یا نجوم الارض طلاب المرام (نشید الشبان)
- ۱۳۵ - ۱۰۔ شاہ جیلاں آن جوان ہاشمی ست فارسی
- ۱۳۶ - ۱۱۔ دستگیر خستہ حالاں شاہ جیلانم توئی
- ۱۳۷ - ۱۲۔ نسیم کوچہ پیرمغاں وزیدامروز
- ۱۳۸ - ۱۳۔ بندہ چہ ساز دیباں خواجہ سلطان تو
- ۱۳۹ - ۱۴۔ درخوبی ودرحسن آفتابے
- ۱۴۰ - ۱۵۔ جشن نوروز گل وقل کا مہینہ آیا اردو
- ۱۴۱ - ۱۶۔ کھول دے بند نقاب رخ زیبا کوئی نعت
- ۱۴۲ - ۱۷۔ پوچھا جو کیف ساقی بزم الست نے
- ۱۴۳ - ۱۸۔ جام دل ٹوٹ کے قیمت مانگے
- ۱۴۴ - ۱۹۔ دل کی پونجی حضور کا غم ہے
- ۱۴۶ - ۲۰۔ گر یہ نیم شب واہ سحر بے تاثیر
- ۱۵۱ - ۲۱۔ یورش رنگ و بوسے کیا ہوگا غزلیات
- ۱۵۲ - ۲۲۔ ہاں قاتل دل، بانی جہاں جزو ہم تمنا کوئی نہ تھا
- ۱۵۳ - ۲۳۔ رات کیوں آتی ہے ہر سمت بکھیرے تارے
- ۱۵۴ - ۲۴۔ بیت بازی
- ۱۶۱ - ۲۵۔ دیکھیں رہ سکتی ہے کس طرح تجلی روپوش
- ۱۶۲ - ۲۶۔ پھیر کر اس نے نظر چہرے پہ ڈالا آنچل
- ۱۶۳ - ۲۷۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
- ۱۶۴ - ۲۸۔ جلوہ حسن ہے نظر دشمن
- ۱۶۵ - ۲۹۔ زیست بے چشم التفات کریں
- ۱۶۶ - ۳۰۔ خوگر ساغر نظر تھا میں
- ۱۶۷ - ۳۱۔ آواز نکلتی ساز ہے یہ اک نغمہ بے آواز نہیں
- ۱۶۸ - ۳۲۔ حسرتیں لاکھ سہی ایک نظر دیکھو تو

- ۱۶۹ ۳۳۔ دل میں ہر جلوہ صدرنگ سمو لو دیکھو
- ۱۷۰ ۳۴۔ گاہے ہنسنا تو گاہے نوحہ گری
- ۱۷۱ ۳۵۔ ترے جلوہ سے ہوئی ہے جو نمود خوش جمالی
- ۱۷۲ ۳۶۔ اس ایک سرو ناز سے جو دو بدوسی ہو گئی
- ۱۷۳ ۳۷۔ مجھ کو بے ضبط جو تم کہتے ہو یار تو سہی
- ۱۷۴ ۳۸۔ ہر قدم پر سوئے منزل دیکھتے
- ۱۷۵ ۳۹۔ ٹیس ہے دل میں مسلسل جیسے
- ۱۷۶ ۴۰۔ سب عشق تیں جس سے تھیں میسر، وہی جو زیر مزار سوئے
- ۱۷۷ ۴۱۔ یوں خون دل نثار کیا اٹک بارنے
- ۱۷۸ ۴۲۔ رہتے تھے ہنستے بولتے کیسے، ابھی کی بات ہے
- ۱۷۹ ۴۳۔ سارے جہاں سے بے نیاز نرگس نیم باز ہے
- ۱۸۰ ۴۴۔ متفرقات

### مقالات الاموی

☆

- ۱۸۳ ۱۔ شاعر الشرق
- ۱۸۷ ۲۔ آخر ملوک الهند
- ۱۹۱ ۳۔ شاعر النار والد مار
- ۱۹۵ ۴۔ البطش والرحمه
- ۱۹۷ ۵۔ تذکار الوداد
- ۲۰۱ ۶۔ الرثاء فی الارذویة

☆☆☆

## حرفِ آغاز

تاج الفحول اکیڈمی اپنے اشاعتی منصوبے کے چوتھے مرحلے میں خانوادہ قادریہ بدایوں کے فرزند حضرت مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی کی متفرق شعری اور نثری نگارشات کا یہ مجموعہ اہل ذوق کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہی ہے۔ اس سے پہلے اکیڈمی آپ کا بہاریہ دیوان ”خمیازہ حیات“ شائع کر چکی ہے، اور دو کتابیں ”احوال و مقامات“ اور ”مختصر سیرت خیر البشر“ طباعت کے مراحل میں ہیں۔

مصنف کتاب مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی حضرت عاشق الرسول مولانا محمد عبدالقدیر قادری بدایونی کے صاحبزادے، حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں کے برادر اکبر، اور اس ناکارہ راقم سطور کے تایا تھے۔

آپ کی ولادت ۱۳/رجب المرجب ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء کو بدایوں میں ہوئی، تعلیمی مراحل اپنے آبائی مدرسے مدرسہ قادریہ میں طے کیے۔ اساتذہ میں والد ماجد کے علاوہ حضرت مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی اور حضرت مولانا عزیز احمد قادری بدایونی کے نام قابل ذکر ہیں، بچپن میں سرکار صاحب الاقتدار شاہ عبدالمقتدر قادری بدایونی قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور والد ماجد کے وصال کے بعد ان کے جانشین اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادہ خانقاہ قادریہ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی، مدرسہ قادریہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور نظام کالج حیدرآباد سمیت مختلف اداروں میں ادب عربی کے استاذ رہے، ۱۹۷۸ء میں نظام کالج حیدرآباد کے شعبہ عربی سے استاذ ادبیات عربی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ جید اور وسیع المطالعہ عالم دین ہونے کے علاوہ عربی ادب ان کا خاص میدان تھا، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے قادر



الکلام شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔

دولت فقر اور مشرب تصوف و سلوک خاندانی ورثہ کے طور پر پایا تھا، ان کی اپنی قلندرانہ شان، طبیعت کے سوز و گداز اور عشق و مستی کی واردات نے ان کے سلوک کو مزید جلا بخشی تھی، اسی کا اثر تھا کہ ہر قسم کا آرام اور آسائش ترک کر کے زندگی کے آخری سات آٹھ سال شہر سے باہر ویرانے میں حضرت بابا بہاء الدین انصاری قدس سرہ کی درگاہ (دولت آباد ضلع اورنگ آباد مہاراشٹر) کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں چٹائی پر گزار دیئے۔

کہتے ہیں کہ مٹی کی کشش آدمی کو کھینچ لاتی ہے، ان کو بھی بدایوں کی مٹی نے اپنی طرف کھینچا، اور وفات سے چند ماہ قبل حضرت صاحب سجادہ اصرار کر کے ان کو بدایوں لے آئے، یہیں ۱۱/ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ/ ۲۲/ جون ۱۹۹۴ء کو انتقال فرمایا اور درگاہ قادری میں آسودہ خاک ہوئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا  
آخری دنوں میں استغراقی کیفیت طاری ہو گئی تھی ایک دن اچانک مجھ سے فرمایا ”شعر سمجھتے ہو؟“ میں نے کہا ”ہاں تھوڑا بہت“، فرمایا ”تو سنو“:

ابھی مزار پر احباب فاتحہ پڑھ لیں  
پھر اس قدر بھی ہمارا نشان رہے نہ رہے

اس کے بعد دیر تک روتے رہے۔

وفات سے کچھ ماہ پہلے ان کے ساتھ درگاہ قادری میں حاضر تھا، مزارات پر لگی ناموں کی تختیاں بلند آواز سے پڑھتے رہے پھر فرمایا ”یہاں سب کے نام کی تختیاں لگی ہیں میرے نام کی تختی نظر نہیں آرہی ہے“۔ کچھ ماہ بعد درگاہ قادری کے شمالی دالان میں مولانا عبدالمجاہد بدایونی اور حکیم عبدالقیوم شہید قادری کے درمیان ان کے نام کی تختی بھی لگ گئی۔ رَحِمَہ اللہ تعالیٰ

۱۱/ شوال ۱۳۹۹ھ میں عرس قادری کے موقع پر صحن درگاہ قادری میں شاہ عین الحق عبدالمجید قادری قدس سرہ کے مواجہہ میں بٹھا کر انھوں نے میرا مکتب پڑھایا تھا جس میں دستور کے مطابق بسم اللہ پڑھا کر بچے کو حروف تہجی پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ گویا میری پہلی درس گاہ تھی اور وہ میرے پہلے استاذ۔ تعلیمی مراحل کی تمام عمارتیں انھیں حروف تہجی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں، آج جو بھی

دو چار لفظ لکھنا پڑھنا آتے ہیں یہ شاید اسی مضبوط بنیاد کا نتیجہ ہیں جو انھوں نے شاہ عین الحق کے مواجہہ میں بیٹھ کر رکھی تھی۔

ان کا معمول تھا کہ عرس قادری کی ہر محفل میں دیگر تازہ نعت و مناقب کے علاوہ اپنے پیرومرشد سرکار شاہ مطیع الرسول محمد عبدالمتقندر قادری بدایونی کی منقبت میں ایک ”ساقی نامہ“ بھی پیش کیا کرتے تھے، ساقی نامہ پڑھنے کا بھی ان کا اپنا خاص انداز تھا، وفور جذبات سے رقت کی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی کہ خود بھی زار و قطار روتے اور محفل بھی اشک بار ہوئے بنانہ رہتی۔ اس ساقی نامے کے آخر میں خاندان کے بچوں کے لیے دعائیہ شعر بھی ہوتے تھے، میری پیدائش کے بعد وہ ہر سال عرس قادری میں اپنے سرکار مقتدر کے وسیلے سے رور و کر بھی دعائیں کرتے تھے:

اسید کو ملے اعزاز و شانِ فضل رسول      عدو دیں پہ پکڑ ہو شدید اے ساقی  
ہیبت حق ہو عیاں روئے اسید الحق سے      شیر بن جائے یہی شیر کا بچہ ساقی  
چمکے چمکائیں اسید اور عطیف و احمد      پھیلے عالم میں ترے گھر کا اجالا ساقی  
یہ اسید و عطیف و فضل رسول      تیرا چمکائیں نام اے ساقی  
جس مقام پر وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے اپنی نااہلی کی وجہ سے وہاں تک تو نہیں پہنچ پایا لیکن یہ کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ درگاہ قادری میں ان کے بہائے ہوئے آنسو بالکل رائیگاں بھی نہیں ہوئے۔ کاش آج وہ موجود ہوتے تو سرکار مقتدر کے فیض اور اپنی دعاؤں کی قبولیت کو دیکھ کر مجھے سینے سے ضرور لگا لیتے۔

عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں انہوں نے خوب لکھا مگر طبیعت میں عجیب و غریب شان استغنا اور قلندری تھی، کبھی مضامین اور شاعری وغیرہ محفوظ کرنے یا باقاعدہ شائع کروانے کی طرف توجہ نہیں کی، بے شمار اردو عربی مضامین شاگردوں اور دوستوں کے نام سے شائع کروادیے، ایک بہاریہ مجموعہ نذر آتش کر دیا، اور جو کچھ باقی رہ گیا وہ زمانے کی دست برد کا شکار ہوا، اکابر خانقاہ قادری کی سیرت و سوانح پر ایک کتاب ”احوال و مقامات“ تصنیف کی، جو ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی اس کے علاوہ نعت و مناقب کے دو مجموعے ”نغمہ قدسی اساس“ اور خرابات“ برادرم فرید اقبال قادری صاحب نے بالترتیب ۱۴۲۱ھ اور ۱۴۲۲ھ میں کراچی سے شائع کیے، بہاریہ

شاعری کا ایک مجموعہ ”خمیازہ حیات“ گزشتہ دنوں تاج الفحول اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ سیرت طیبہ پر ایک مختصر اور جامع رسالہ طباعت کے مراحل میں ہے۔ اس مطبوعہ مواد کے علاوہ ان کی بکھری ہوئی شعری اور نثری نگارشات کا مختصر انتخاب ”باقیات ہادی“ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

### عربی اردو میگزین الاشعة

۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں ان کے زیر نگرانی شعبہ عربی نظام کالج حیدرآباد سے ایک عربی اردو میگزین الاشعة جاری ہوا، جس کے اردو حصے میں مضامین اپنے اصلی نام سے اور عربی حصے میں کبھی اصلی نام سے اور کبھی صاحب القلم الاحمر یا الاستاذ الاموی کے فرضی ناموں لکھتے تھے، اس میگزین کے کئی شمارے ہمارے پیش نظر ہیں، اس میں آپ کا نام مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا، خود ان کے علاوہ شعبہ عربی کے طلبہ کے اردو عربی مضامین شائع ہوتے تھے، مضامین میں اسلوب کی یکسانیت اور موضوعات کو دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ یہ سب کے سب مضامین حضرت ہادی ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں، اس قیاس کے علاوہ ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان مضمون نگاروں میں سے بعض کو ہم شخصی طور پر جانتے ہیں کہ ان کو عربی نہیں آتی ہے اور نہ ہی وہ اس معیار کے اردو مضامین لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے حضرات کے مضامین ہم نے زیر نظر کتاب میں شامل کر لیے ہیں، جن کی طرف ہم آگے اشارہ کریں گے۔

### پروفیسر ایوب قادری کی کرم فرمائی

عم مکرم حضرت ہادی القادری کے عربی مضامین اور عربی قصائد ترتیب دیتے وقت بے ساختہ ذہن پروفیسر ایوب قادری صاحب کے چھوڑے ہوئے ایک شگوفے کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۷۵ء میں حضرت مولانا عبدالواحد قادری بدایونی (ابن مولانا عبدالماجد بدایونی) کی وفات ہوئی، اس پر پروفیسر صاحب نے لکھا:

”بڑی خوبیوں کے بزرگ اور اپنے اسلاف کے صحیح جانشین تھے، مولانا فضل رسول بدایونی کے خاندان میں اب کوئی شخص عربی جاننے والا نہیں رہا، یہ آخری

رکن تھے، دو سو سال سے جس خاندان میں قال اللہ قال الرسول کا چرچا تھا اب بالکل معدوم ہو گیا۔“

(مکتوب ایوب قادری بنام حکیم محمد موسیٰ امرتسری محررہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۵ء، مشمولہ تذکرہ اکابر اہل سنت پاکستان: علامہ عبدالحکیم شرف قادری، ص ۲۷۸، اسلامک پبلی کیشنز کانپور سنہ ندارد)

قادری صاحب کی اس بات پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے اس کے جواب میں ہم زیر نظر کتاب ”باقیات ہادی“ کے عربی صفحات پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں، یاد رہے کہ جس زمانے میں مولانا عبدالواحد قادری صاحب کی وفات ہوئی اسی زمانے میں سابق الذکر عربی میگزین الاشعة نکل رہا تھا، جس میں مولانا فضل رسول بدایونی کے پر پوتے حضرت ہادی القادری عربی نثر و نظم میں اپنی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے، اب اگر عربی میگزین ”الاشعة“ کے شمارے یہ خیال کر کے پروفیسر ایوب قادری صاحب کو نہ بھیجے گئے ہوں کہ یہ صرف ”عربی جاننے والوں“ کو بھیجے جائیں گے، تو اس میں ”مولانا فضل رسول بدایونی کے خاندان“ کا کوئی قصور نہیں: دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

حضرت ہادی مولانا عبدالواحد بدایونی کی وفات کے بیس سال بعد تک باحیات رہے اور عربی نظم و نثر اور علوم اسلامیہ میں اپنی مہارت کا ثبوت دیتے رہے۔ خیر یہ تو پرانی بات تھی، کاش ڈاکٹر ایوب قادری صاحب آج باحیات ہوتے تو میں اطلاعاً اتنا ضرور عرض کرتا کہ آج بھی ”مولانا فضل رسول بدایونی کے خاندان“ کے کچھ افراد عربی اور ”قال اللہ قال الرسول“ (علوم اسلامیہ) میں مہارت نہ سہی الحمد للہ تھوڑی بہت عُد ضرور رکھتے ہیں، فَهَلْ مِنْ مُبَارِزٍ؟؟؟

## باقیات ہادی

زیر نظر مجموعے میں اس مواد کا انتخاب ہے جو عجلت میں دستیاب ہو سکا، اس کو ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے

(الف) مضامین ہادی۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں:

۱۔ استاذ الاساتذہ (۲) عید اور عیدی (۳) رُغم الانف (۴) عرب اور سفارت (۵) عربوں کا فن حرب (۶) عرب اور کتا (۷) دھوپ چھاؤں (۸) خطیب اور خطبہ۔

استاذ الاساتذہ اسی سال ماہنامہ جام نور دہلی میں شائع ہو چکا ہے، عید اور عیدی عرس قادری کی روداد ’ریاض میکشی‘ (۱۳۹۰ھ) میں شائع ہوا تھا، رُغم الانف کی نقل کتب خانہ قادری میں محفوظ تھی، یہ اگرچہ ڈاکٹر مسعود صاحب کے نام ایک خط ہے مگر طوالت اور موضوع کو دیکھتے ہوئے اس کو مضامین میں شامل کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا، ان کے علاوہ باقی مضامین الاشعہ سے لیے گئے ہیں، دھوپ چھاؤں حضرت ہادی کی ہمشیرہ کے نام سے اور خطیب اور خطبہ حضرت ہادی کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری کے نام سے الاشعہ میں شائع ہوا تھا۔

(ب) مکاتیب ہادی۔ اس میں حضرت صاحب سجادہ کے نام خطوط خود ان کے ذخیرہ خطوط سے لیے گئے ہیں، حضرت عبدالمجید اقبال قادری صاحب کے نام خطوط انہوں نے کراچی سے دستیاب کروائے، مکتوب بنام مفتی عزیز احمد صاحب کی نقل کتب خانہ قادریہ میں محفوظ تھی، اور پھر ایک نقل اورنگ آباد سے بھی دستیاب ہوئی۔ حافظ عبدالمولیٰ قادری بریلوی (م دسمبر ۱۹۹۱ء) استاذ الحفاظ حضرت سید عبدالکریم قادری بریلوی کے صاحبزادے، اور حضرت ہادی القادری کے بے تکلف دوست تھے، ان کے نام مکتوبات ان کے صاحبزادے الحاج عبدالسبحان صاحب قادری بریلوی نے عنایت کیے۔ ڈاکٹر اسعد بدایونی جدید لب و لہجہ کے معروف شاعر اور علی گڑھ میں شعبہ اردو کے استاذ تھے، ان کے نام خط کی نقل اورنگ آباد سے حاصل ہوئی۔ مولانا معین الدین قادری جیلانی سلطان پور کے رہنے والے، مدرسہ قادریہ بدایوں کے فاضل، عدالت عالیہ (حیدرآباد) میں حضرت عاشق الرسول کے پیش کار اور حضرت ہادی القادری کے بے تکلف دوست تھے، بعد میں حضرت ہادی کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری کی شادی ان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کے نام خط بھی اورنگ آباد سے دستیاب ہوا۔

(ج) نغان ہادی۔ اس حصہ میں پہلے عربی پھر فارسی، پھر اردو نعت و مناقب اور اس کے بعد ردیف و ارغز لیت کو شامل کیا گیا ہے، جن غزلوں پر تاریخ و سنہ موجود تھی اس کو درج کر دیا ہے

تاکہ عہد کا اندازہ ہو سکے، اس حصہ میں شامل عربی، فارسی اردو منظومات کا زیادہ تر حصہ حضرت ہادی کی صاحبزادی بیگم سید اکرام احمد رزاقی نے فراہم کیا ہے، اور کچھ اردو غزلیات حضرت ہادی کی ہمیشہ بیگم خواجہ احتشام الدین قادری نے عنایت کیں۔ دصفغان ہادی میں شامل تخلیقات دو ایک کوچھوڑ کر سب پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔

(د) مقالات الاموی۔ الاشعہ میں چونکہ وہ ”الاستاذ الاموی“ کے نام سے عربی مضامین لکھتے تھے اس لیے عربی مضامین کے حصے کا نام مقالات الاموی رکھا ہے، اس میں موجود سبھی ۶ مقالات الاشعہ سے لیے گئے ہیں، ایک مضمون البطش والرحمة ان کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری کے نام سے شائع ہوا تھا۔

نہایت عجلت میں جو کچھ حاصل ہوسکا اس کا مجموعہ حاضر خدمت ہے، میرے خیال سے حضرت ہادی کی اب تک کی شائع شدہ نگارشات ان کی اصل کاوشوں کا نصف بھی نہیں ہیں، الاشعہ کے سب شمارے دستیاب ہوں، اور کچھ روز مجھے حیدرآباد اورنگ آباد میں قیام کی فرصت ملے تو اور بہت سا مواد جمع ہوسکتا ہے۔

آخر میں حضرت صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو حضرت ہادی کے بھائی تو ہیں ہی مرشد طریقت بھی ہیں، انہیں کے حکم سے میں نے اس کام کا آغاز کیا اور انہیں کی دعاؤں کے نتیجے میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

ترتیب و تصحیح میں جو بھی خامیاں رہ گئی ہیں ان سب کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے رب قدیر و مقتدر کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ میری خامیوں اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی فرمائے اور مجھے اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔

اسید الحق قادری

۲۴ رذوالحجہ ۱۴۳۰ھ

مدرسہ قادریہ بدایوں

۱۲ دسمبر ۲۰۰۹ء



# مضامین ہادی

## استاذ الاساتذہ

### مفتی اکرام احمد لطف بدایونی کی حیات اور شاعری

#### ایک جائزہ

بدایوں ایک قدیم شہر اور علمی مرکز کی حیثیت سے برصغیر میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ شرفائے بدایوں میں صدیقی حمیدی خاندان تعداد کے اعتبار سے سب سے بڑا خاندان ہے۔ ذیلی طور پر اس خاندان کی تقسیم تین گھرانوں میں ہے۔ بڑے صاحبزادے افضل محمد، دوسرے صاحبزادے غلام محمد اور تیسرے صاحبزادے محمد ماہ کی اولادیں حمیدی گھرانے ہیں۔ ان تین حمیدی گھرانوں میں پہلی شاخ تعداد میں سب سے کم، دوسری شاخ پہلی سے زیادہ اور تیسری شاخ سب سے زیادہ ہے۔ یہاں جن کا تذکرہ مقصود ہے ان کا تعلق افضل محمدی گھرانے سے ہے۔ اس گھرانے کے لوگ اپنے علمی وقار کی وجہ سے مفتی کہلاتے ہیں۔

مفتی لطف علیہ الرحمۃ کا نام مفتی اکرام احمد اور لطف تخلص تھا۔ نسباً صدیقی مسلکاً حنفی اور ارادۂ قادری تھے۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد مفتی غلام جیلانی علیہ الرحمۃ کا شمار شہر کے عمائد میں تھا۔ ظاہری دولت کے ساتھ نعمتِ علم و فن اور باطنی سوز و گداز سے قلب معمور تھا۔

مفتی غلام جیلانی علیہ الرحمۃ کو فن تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ بلا تکلف گفتگو کے جملے بھی اعداد و جمل کے اعتبار سے تاریخی ہوتے تھے۔ چچا علیہ الرحمۃ (مولانا مفتی کرم احمد میخوار قادری فرزند اوسط) نے سنایا کہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے ایک صاحب فن آئے۔ ان کی تاریخ گوئی کا بڑا چرچا تھا۔ والد صاحب قبلہ اُن سے ملنے گئے اور گفتگو شروع کی، گفتگو اتنی رواں اور بے تکلف تھی کہ یہ



شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان جملوں میں فن برتا جا رہا ہے۔ وہ صاحب خالی الذہن تھے کہ مقابل صاحب فن ہے اس لئے والد صاحب کو جواب میں وہ خوبی نہ ملی۔ تھوڑی دیر بعد یہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا ”رخصت“ تو لکھنوی صاحب کو محسوس ہوا کہ مفتی صاحب غفلت میں چوٹ دے چلے تھے۔ (رخصت کے اعداد بحساب جمل بارہ سو نوے ۱۲۹۰ ہوتے ہیں) انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا پھر بیٹھ کر دیر تک دونوں فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔

ان کی کبھی ہوئی متعدد تاریخیں ان کے مجیدی پیر بھائیوں کے مزاروں پر کندہ ہیں۔ وہ فن میں ندرتیں پیدا کیا کرتے تھے۔ مثلاً درگاہ قادری کے عرس ۱۳۰۰ھ کی تاریخ انھوں نے اپنے تینوں صاحبزادوں اور دو پوتوں کے ناموں سے اس طرح نکالی ہے کہ ان پانچوں کے آخری حروف کے اعداد کو پانچ سے ضرب دو۔

فضل و کرم، اکرام و حسین و صدیق  
پانچوں کے ہیں پنج گونہ حرف آخر

$$۱۳۰۰ = ۵ \times ۲۶۰ = ۱۰۰ + ۵۰ + ۲۰ + ۴۰ + ۲۰ + ۳۰$$

مفتی اکرام احمد لطف علیہ الرحمہ کو ذہانت اور فن سے لگاؤ وراثت میں تو ملا ہی تھا، سونے پر سہاگہ یہ کہ اس زمانے سے ہی کہ ”عجمیا“ (یہ لفظ انھیں کا ہے، پاجامے کی تصغیر) نہیں سنبھلتی تھی مدرسہ قادریہ پہنچا دئے گئے جہاں اس وقت ”باوا“ (مولانا نور احمد قادری تلمیذ علامہ فضل حق خیر آبادی) اور حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری بدایونی (میاں حضرت) مسند درس پر جلوہ افروز تھے۔ بحر العلوم علامہ محمد علی قادری کے پوتے اور مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی کے صاحب زادے حضرت مولانا حکیم سراج الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ (پھوپا صاحب) اور حضرت مولانا مطیع الرسول عبدالمتقندر قادری قدس سرہ فیض بار تھے۔ مفتی لطف کو سب کے سامنے زانوائے ادب نہ کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ جوں سال استاذ (صاحب الاقتدار مولانا عبدالمتقندر قادری قدس سرہ) کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے۔ اس وقت تک استاذ پر وہ استغراقی کیفیت مستولی نہیں ہوئی تھی جو بعد میں دیکھی گئی۔ استاذ نے شاگرد میں جو ہر قابل محسوس کیا اور شعور ادبی کو نکھارنے پر ایسی توجہ فرمائی جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔

مفتی لطف نے بتایا کہ ”استاذ نے شعر کہنے کا حکم دیا، روز طرح دی جاتی، شعر کہنے کی ہدایت

فرمائی جاتی، طرح میں مصرعہ کم دیا جاتا، اکثر قافیہ دیا جاتا، ردیف اور بحر کا انتخاب ہمیں خود کرنا پڑتا۔ ہم دن بھر فکر سخن کرتے، عشا کے بعد جب وہ زنانے مکان تشریف لے جاتے تو ہم دروازے تک ساتھ جاتے اور کاغذ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔ فجر کے بعد پھر ساتھ جاتے تو دروازے میں تخت پر بیٹھ کر ہماری غزل ہمارے ہاتھ میں دی جاتی۔ جو اصلاحات سے پرہوتی۔ ہم پڑھ چکے تو پوچھا جاتا یہ ترمیم کیوں کی گئی، یہ لفظ کیوں بدلا گیا؟ اس تقدیم تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ ہم جوابات دیتے تو فرماتے سمجھ گئے۔ پھر غزل ہم سے مانگ کر کاغذ چاک کر دیا جاتا۔ آج کے لئے تازہ طرح مل جاتی اور ہم پھر دن بھر فکر سخن میں مبتلا رہتے۔

روزانہ طرح دینے، رات کو ہماری دن بھر کی کاوش ساتھ لے جانے، صبح ترمیمات دکھانے اور باریکیاں سمجھا کر غزل چاک کر دینے کا یہ سلسلہ پورے سال بھر جاری رہا۔ اب اصلاح اکثر نہ ہوتی، ایک آدھ لفظ کا الٹ پھیر ہوتا، وہ بھی کبھی کبھی، مگر غزل ہمیں واپس نہ ملتی اور چاک کر دی جاتی۔ اب ہمیں کوفت ہونے لگی کہ اگر ہماری غزلیں جمع ہوتیں تو ہم صاحب دیوان ہو چکے ہوتے۔ تین سو ساٹھ غزلیں تو ہوتیں ہی۔ دو غزلے سہ غزلے کا شمار نہیں۔ آخر ایک روز جب انھوں نے چاک کرنے کے لئے کاغذ مانگا تو ہم نے ہمت کر کے ہاتھ کھینچ لیا اور صاف کہہ دیا اب ہم غزل پھاڑنے نہیں دیں گے۔

سال بھر کی اس گھسائی کے بعد کہیں ہماری بیاض بن پائی۔ اس کے بعد پھر کوئی غزل چاک نہیں کی گئی۔ کئی مہینے گزر گئے۔ ہماری بیاض میں بہت سی غزلیں جمع ہو گئیں۔ آخر ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد جب مدرسہ قادریہ میں سب بیٹھے اور شعر و شاعری کا دور شروع ہوا تو استاذ نے پہلی بار ہم سے فرمایا ”اکرام احمد آج تم کچھ سناؤ“۔ ہمارا سینہ مارے خوشی کے اتنا (اشارہ کرتے ہوئے) بڑا ہو گیا کہ آج نے اس قابل سمجھا کہ ان بزرگوں کے سامنے ہمیں شعر پڑھنے کا موقعہ دیا۔ ہم نے بیاض نکال کر جلدی جلدی ورق الٹنے شروع کئے تاکہ ایسی غزل کا انتخاب کریں جس سے ہمارا مرتبہ قائم ہو جائے اور ایک باکی غزل شروع کی تو استاذ نے روک دیا۔ یہ نہیں وہ غزل سناؤ (جسے ہم نے ان سے چھین لیا تھا) اب جو ہم وہ غزل نکالتے ہیں تو اپنی نگاہ میں ہی نہیں جھپتی۔ بڑی چہ کنم میں رہے کچھ سوچا ہی نہیں۔ جھٹ سے وہ صفحہ پھاڑ پڑہ کر دیا تو استاذ نے مسکرا کر

فرمایا ”جب ہم پھاڑتے تھے تو ہاتھ پہنچ لیا تھا، اب خود پھاڑ پھینکی۔“

آئینہ سازی کی یہ داستان مفتی علیہ الرحمہ نے متعدد مرتبہ سنائی ہے۔ پھر بھی آج جب میں اسے لکھ رہا ہوں تو ممکن ہے اس میں لفظی تغیر ہو گیا ہو کیونکہ میرا شمار راویانِ حدیث میں نہیں ہے مگر نفس واقعہ میں حقیقت سے سرِ موجاؤز نہیں ہوا ہے۔

شعر کے سلسلہ میں مفتی لطف سے جو خصوصی مشق کروائی گئی اس کی وجہ ان کی صلاحیتوں کو ان کے استاذ کا محسوس کر لینا تھا، چنانچہ مفتی جی کو دیکھنے والے ابھی سیٹروں موجود ہوں گے انھوں نے انھیں ”چوبیس گھنٹے شاعر“ ہی دیکھا ہوگا۔ اکثر کو تو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ژولیدہ موشاعر جید عالم بھی تھا۔ نہ صرف علوم ادبیہ پر اس کی نگاہ تھی، منطق فلسفہ، تفسیر حدیث اور فقہ کا کونسا مسئلہ ہے جو اسے معلوم نہ تھا۔ مگر مفتی جی نے جو صرف خاندانی اعتبار سے ہی نہیں اپنے علم کے اعتبار سے بھی مفتی کہلائے جاسکتے تھے۔ خود کو شاعر کے علاوہ کسی اور حیثیت سے روشناس نہیں کرایا۔

مفتی لطف علیہ الرحمہ کا شمار اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ فن میں کرنا چاہیے۔ وہ ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ فن کے غوامض پر نگاہ تھی۔ اس لئے محاسن کو برتنے اور معائب سے اجتناب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ہر قسم کا شعر ملتا ہے لیکن اسقام سے بہر حال پاک ہوتا ہے۔ ایک طویل غزل فرمائی، پہلا مطلع تھا۔

سونا کیسا فرقت میں فکر میں تھے جی کھونے کی رات تو ہم یہ سمجھے تھے صبح نہیں اب ہونے کی کیسا کیفیت میں ڈوبا ہوا مطلع ہے مگر پھر ایک مطلع فرمایا۔

کس نے رسم نکالی ہے تخم الفت بونے کی پھل ملتا ہے برائی کا کیجئے اس میں جو نیکی اسے استاذی کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اسے کیا کہوں کہ اسی پر بس نہیں کیا، ارشاد فرمایا۔

ان کی یہ دونوں چیزیں ہیں ہوش ہمارے کھونے کی ہاتھ کا چھلا چاندی کا کان کی دُریا سونے کی تو عرض کر ہی گذرا ”استاذ اس مطلع کی کیا ضرورت تھی؟“ فرمایا ”حقیقت واقعہ ہے تو اس کے اظہار کو کیوں معیوب سمجھا جائے۔“ یہاں تک بھی غنیمت تھا، مگر تان تو یہاں جا کر ٹوٹی۔

پھنس کر اپنے پھندے میں اُڑ گئی چڑیا سونے کی  
 بہر حال اس قسم کے اشعار بھی فنی اور لسانی اعتبار سے کسی طرح کم رتبہ نہیں کہے جاسکتے۔ مزاج  
 چونکہ عاشقانہ صادقانہ تھا اس لئے بے اختیارانہ اس قسم کے اشعار کہہ جایا کرتے تھے۔ اپنی اس  
 فطری کمزوری کو خود تسلیم کرتے ہیں

بلا سے اپنی کوئی ہو مگر ہاں آئینہ رو ہو جناب لطف ہیں لطف صفائی دیکھنے والے  
 ایک غزل سنائی جس کی ابتدا یوں ہوئی تھی

کچھ کھا کے سو رہی ہیں یہی آتا تھا جی میں رات

مگر پھر جو جذبات میں موڑ آیا ہے، بات کہاں سے کہاں پہنچی  
 باقی نہیں رہی کوئی امید جی میں رات سوئے گلے لگا کے انھیں چاندنی میں رات

اور

وقت سخن وہ طرز تبسم نہ پوچھے تارے چمک رہے تھے کسی کی ہنسی میں رات  
 پھر تان یہاں جا کر ٹوٹی

اک سانس نے لوٹ لیا سانسنی میں رات

سانسنی علی گڑھ کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں مشاعرے میں استاذ نے شرکت کی تھی، سانسنی کی  
 مشابہت سے اس وقت کا آئینہ رو غارت گر ہوش سانسیا بن گیا، جو ایک خانہ بدوش قبیلہ ہوتا تھا  
 ممکن ہے اب بھی ہوتا ہو مگر مجھ میں دشت نوردی کی ہمت کہاں ہے۔

لطف کی شاعری میں خاص لطف اس وجہ سے اور بھی پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اردو شاعری کے  
 دونوں مدرسوں دہلی اور لکھنؤ سے مساویانہ استفادہ کرتے ہیں۔ جہاں تک زبان اور محاورے کا  
 تعلق ہے ان کے یہاں دہلویت جلوہ گر نظر آتی ہے اور جہاں فنی نزاکتوں کی طرف توجہ کی ہے وہ  
 لکھنوی بن گئے ہیں۔ اوپر جو اشعار گزرے ہیں ان سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ دیوان سامنے  
 نہیں ورنہ سیکڑوں مثالوں سے وضاحت کی جاسکتی تھی۔

مفتی لطف کو نام و نمود سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا۔ مشاعروں میں بھی بہت کم شرکت کرتے  
 تھے مگر اس زمانے کے نامور اساتذہ انھیں خاص رتبہ دیتے تھے چنانچہ میں نے خود دو بزرگ

ہستیوں کو ان سے ملتے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے کہ بڑے ہی بڑائی کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ دونوں حضرت سید علی احسن احسن مارہروی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید حسین احمد بیباک شاہجہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

اس گوشہ نشینی کے باوجود مفتی لطف علیہ الرحمۃ کی ایک غزل تو ہندوستان میں ایسی مشہور ہوئی کہ گلی گلی گائی جاتی تھی۔ اب تو غالباً کوئی یہ جانتا بھی نہ ہو کہ وہ حضرت مفتی لطف ہی تھے جنہوں نے کہا تھا

تو وہ مہ خوبی ہے اے جلوہ جانانہ      ہر گل ہے ترا بلبل ہر شمع ہے پروانہ  
مستی میں بھی سراپنا ساقی کے قدم پر ہو      اتنا تو کرم کرنا اے لغزش مستانہ  
یارب انھیں ہاتھوں سے پیتے رہیں متوالے      یارب یہی ساقی ہو یا رب یہی میخانہ  
مفتی علیہ الرحمۃ کو مشکل زمینوں میں طبیعت کے جوہر دکھانے کا خاص ملکہ تھا۔ جہاں ایک آدھ شعر کہنا بھی دشوار نظر آئے وہاں وہ سیر حاصل غزل فرماتے تھے اور کمال یہ تھا کہ یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ زبردستی قافیہ پیمائی کی گئی ہے۔ اس وقت چند شعر یاد آرہے ہیں، فرماتے ہیں میری قسمت ہوا اگر ساغر میں ساغر ہاتھ میں      عمر بھر ساقی رہے چکر میں چکر ہاتھ میں  
یہ چکر میں چکر آدمی کو گھن چکر بنا ڈالے مگر استاذ نہایت حسن و خوبی سے اس سے عہدہ برا ہوئے ہیں

ہاتھ سے صیاد کے اب بچ کے جانا ہے محال      قوت پرواز ہے شہپر میں شہپر ہاتھ میں  
ان کی بلند پروازیاں جاری رہتی ہیں، نعت کی طرف مڑ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں  
اللہ اللہ شان اعجاز پیمر دیکھئے      طاقتِ گفتار ہو پتھر میں پتھر ہاتھ میں  
اساتذہ کی زمینوں میں طبع آزمائی بڑی دشوار ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ کہنے والے نے حق ادا کیا ہو مگر مفتی علیہ الرحمۃ کی طبیعت ایسے میں بند نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر اس کا التزام کرتے تھے کہ انھیں قوافی میں مطلع ہو جن میں پیشرو کہہ گیا ہے۔ غالب کی مشہور غزل ہے، دم نکلے، کم نکلے۔ غالب کے قوافی میں یہ مطلع جان غزل ہے  
دم آخر یہ حسرت تو الہی کم سے کم نکلے      وہ انداز تبسم دیکھ کر آنکھوں سے دم نکلے

اب اسے غالب کے مطلع سے ملا کر پڑھئے  
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے  
وہ نا آسودگی اور حسرت تمام جو ”یہ حسرت تو الہی کم سے کم نکلے“ میں ہے غالب کے یہاں  
کہاں ہے؟

ناتخ کا ایک مطلع ہے اور حیرت ہے کہ ناتخ کا ہی مطلع ہے  
دو چار حزیں اور پہنچ جائیں جو ہم سے ہستی کی طرف منہ نہ کرے کوئی عدم سے  
اپنے رنگ سے ہٹ کر بڑی نازک بات کہی ہے، اس کا جواب نہیں ہو سکتا، یہ اور بات ہے  
کہ آلام ہستی سے نبرد آزما یا پسپا ہو کر جانے والے جس عدم کی طرف جاتے ہیں وہ اس عدم سے  
علیحدہ ہے جس سے نکل کر آنے والے ہستی کی طرف آتے ہیں۔ پھر بھی اشتراک لفظی نے بات  
پیدا کر دی ہے جس کی داد نہ دینا کفریات ادبی یا کم سے کم بے ادبی میں ضرور شمار ہوگا۔

آکا (مولانا عبدالماجد قادری بدایونی منظور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ہم سب انھیں ”آکا“ ہی  
کہتے تھے۔ یہ ترکی لفظ ہے، بڑے بھائی کے معنی میں) کے انتقال پر ایک عالم متاثر اور سوگوار تھا۔  
مفتی لطف کے لئے یہ دہرا صدمہ تھا، کیونکہ وہ حکیم شہید (مولانا حکیم عبدالقیوم قادری جوش علیہ  
الرحمۃ، آکا کے والد) کے دوستوں میں تھے۔ شہید مرحوم کے بعد انھوں نے ماجد میاں میں تسلی پا  
لی تھی کہ وہ بھی اچانک بچھڑ گئے۔ جلسہ تعزیت ہوا، مقررین اور شعراء نے خراج عقیدت پیش کیا۔  
مفتی جی نے ناتخ کی زمین میں درد و الم کا اظہار کیا۔ انھیں توانی میں یہ مطلع درد و اثر کی کیسی نرالی  
شان رکھتا ہے۔

جانے کو تو جاتا ہے جو آیا ہے عدم سے افسوس تو اس کا ہے یہ پہلے گئے ہم سے  
اور آخر میں فرمایا

تھا لطف سخن حضرت منظور کے دم سے

لطف سخن اور حضرت منظور کے ساتھ ایک واقعہ یاد آگیا۔ عرس قادری کا سارا اہتمام آکا کے  
ہاتھ میں تھا۔ علاوہ اور مشاغل کے ایک شب مشاعرے کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ مشاعرہ طرچی ہوتا  
تھا، مقامی شعرا کے علاوہ باہر سے بھی بڑے بڑے شعرا اس میں شرکت کرتے تھے۔ ایک سال آکا

نے بہت ہی مشکل طرح دے دی، غالباً ظہر کے بعد مفتی لطف علیہ الرحمہ سے کہا ”مفتی جی! ایسی طرح دے دی ہے کہ ڈھنگ کے سات (صحیح یا ذہیں سات یا نو) شعر نکالنا بھی مشکل ہو جائے گا۔“ انھوں نے کہا ”ماجد ایسی باتیں نہیں کرتے، شعر کہنے والے کے لئے کوئی طرح مشکل نہیں ہوتی۔“ آکانے کہا ”سب باتیں ہیں، آپ بھی نو (یا ذہیں نو یا گیارہ) شعر سے زیادہ نہیں نکال سکیں گے۔“ انھوں نے کہا ”شرط رہی،“ آکانے کہا ”رہی، جتنے شعر زیادہ ہوں گے ان کے حساب سے (صحیح یا ذہیں، نقد روپیہ یا سیر بھر مٹھائی) ادا کروں گا۔“

مفتی لطف پنسل کاغذ لے کر شاعری کے اڈے پر پہنچ گئے (دوران عرس قادری اکثر درگاہ قادری کے پیچھے چبوترے پر بیٹھ کر فکر خن کیا کرتے تھے) عصر کے قریب مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ آکانے دور سے دیکھ کر ہی محسوس کر لیا کہ شرط ہار دی۔ منابھائی (استاذ کے عزیز شاگرد) آکا کے پاس تھے۔ آکانے کہا، منا! مفتی جی کی غزل چراؤ، منابھائی نے کہا یہ کیا بڑی بات ہے، پنسل کاغذ نیفے میں اڑسا ہوگا، ابھی لایا۔ لپکے اور ان کے درگاہ کے بڑے دروازے سے نکلنے سے پہلے ہی شاگرد استاذ کے پاس تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں بنائیں اور آہستہ سے پائینچہ ذرا کھینچ دیا۔ غزل نیچے آرہی، استاذ آگے بڑھے اور غزل شاگرد کی جیب میں پہنچی، منابھائی نے اشارہ کر دیا کہ کام ہو گیا۔

مفتی لطف دفتر عرس قادری کے شامیانے میں پہنچے، جہاں آکا کی نشست رہتی تھی۔ آکا نے کہا ”کیوں مفتی جی غزل کہلائے، کتنے شعر ہوئے؟“ انھوں نے بتایا (سترہ یا پچیس صحیح یاد نہیں)۔ آکانے کہا ”آؤ مشاعرے سے پہلے ہی ہم ایک دوسرے کو سنالیں اور تصفیہ ہو جائے۔“ اب جو مفتی جی نیٹاٹولتے ہیں تو کاغذ پنسل غائب، بہت شپٹائے۔ آکانے چوٹ کی ”غزل ہوئی بھی تھی یا ویسے ہی دھاک ڈال رہے تھے۔“ مفتی جی کو غصہ آ گیا فرمایا ”کیا ہوا؟ اتنے ہی شعر اور کہہ لوں گا“ اور پھر عصر سے مغرب تک اپنے مہبط شعر پر فکر خن میں غرق رہے۔ مغرب کے بعد آکانے پھر کہا ”مفتی جی آؤ آپس میں غزلیں سنالیں“، مگر یہ راضی نہ ہوئے فرمایا ”اب تو مشاعرے میں ہی تصفیہ ہوگا۔“

مشاعرے میں آکانے غزل شروع کی تو وہی غزل تھی جو شاگرد نے چرا کر ادھر پہنچا دی تھی،

مفتی جی تلملار ہے تھے کہ بھتیجا چوری کی غزل پڑھ رہا ہے مگر آکا نے مقطع لطف کا ہی پڑھا اور پھر اپنی مختصر غزل پڑھی اور جب شمع مفتی لطف علیہ الرحمۃ کے سامنے آئی ہے تو محسوس ہوا کہ وہ اشعار جو سنائے جا چکے وہ تو نقشِ اولیں تھے، مشاعرے کے بعد آکا نے شرط کے مطابق دونوں غزلوں کے مجموعی اشعار کے حساب سے جرمانہ ادا کیا اور لطف یہ ہے کہ وہ جرمانہ یا انعام اسی شاگردِ رشید نے وصول کیا جس نے استاذ کی غزل چرائی تھی۔

ان کی قادر الکلامی کے ثبوت میں یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک اور واقعہ میں استاذ کی نعت گوئی کے ضمن میں بیان کروں گا جس سے قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ بدیہ گوئی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یوں تو مفتی لطف بہار یہ شعر میں بھی بلند مقام رکھتے تھے مگر نعت و منقبت تو جیسے ان کا حصہ ہے۔ جذبات کی فراوانی، آداب و احترام کا پاس اور صحت روایات ہر اعتبار سے ان کا یہ کلام بے مثال ہے۔

فرماتے تھے ”حقیقی عاشقانہ شاعری تو نعت و منقبت میں ہی کی جاسکتی ہے“۔ وہ ربط دروں جو ایک دستہ گرفتہ کو اپنے شیخ سے، ایک مسلمان کو اللہ کے محبوب رسول ﷺ سے ہونا چاہیے اس کا عشرِ شیر بھی بڑے سے بڑے مجنوں لیلیٰ اور فرہاد و شیریں میں نہیں ہو سکتا لیکن نعتیہ شاعری جتنی حقیقی عاشقانہ ہے اتنی ہی دشوار بھی ہے کیونکہ یہاں قدم قدم پر گرفت ہے، پاس آداب جذبات اور اظہارِ دونوں کا دامن کشاں رہتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز مدرسہ قادریہ میں حضرت اقدس (حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری بدایونی) کو مفتی جی نے ایک نعت سنائی۔ مطلع سن کر حضرت اقدس نے فرمایا ”مفتی جی یہ آپ ہی کہہ سکتے تھے (مفتی پر خاص زور ہے)

اللہ رے شانِ حسنِ خدا سازِ مصطفیٰ وہ ذاتِ بے نیاز ہو اور نازِ مصطفیٰ  
اس ”خدا ساز“ نے حضورِ بے نیاز، ناز کا کیسا موقعہ پیدا کر دیا ہے، سبحان اللہ۔  
اسی نعت کا ایک اور مطلع ہے

انساں کا دل تو کیا دمِ اعجازِ مصطفیٰ پتھر میں گھر کرے قدمِ نازِ مصطفیٰ



غالب کی زمین میں اوپر ایک مطلع کا تذکرہ کر چکا ہوں، اب اسے پھر پڑھئے اور یہ سمجھ کر پڑھئے کہ یہ نعت میں ہے تو اس کا اور ہی لطف محسوس ہوگا

دم آخر یہ حسرت تو الہی کم سے کم نکلے وہ انداز تبسم دیکھ کر آنکھوں سے دم نکلے حسنِ خاتمہ کی اس سے بہتر کیا صورت ہو سکتی ہے کہ جمالِ رحمتِ عالم بے حجاب سامنے ہو۔

دوسرا مطلع دیکھئے دو لفظوں کے الٹ پھیر سے کیا بات پیدا کی ہے

غمِ الفت ہے دم کے ساتھ دم نکلے تو غم نکلے محبت کا مزا یہ ہے نہ غم نکلے نہ دم نکلے زندگی ہو کہ موت دونوں ان کے ساتھ وابستگی سے ہی لذت آگیں بنتی ہیں۔ کیا خوب کہا ہے

یہ لطفِ زندگانی ہے کہ ہونظارہ اس رُخ کا مزا مرنے کا جب آئے کہ ان قدموں پہ دم نکلے بغیر اقرار رسالتِ ہدایت ممکن نہیں، اسی کو عشق و محبت کی زبان میں کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

ہمارا کام تھا راہِ محبت میں قدم رکھنا تمہیں نے دستگیری کی تو اب کچھ پاؤں جم نکلے ربطِ باہمی دیکھئے کیا بات ہے

اسے کہتے ہیں باہم دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اُدھر محشر میں وہ آئے، ادھر مرقد سے ہم نکلے اِنکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ کی کیسی واقعاتی تفسیر ہے

یہ شانِ خلق ہے وہ بسمِ تلخِ محبت ہو جو گھر سے بہر قتلِ شاہ دیں کھا کر قسم نکلے اسی طرح مناقب میں والہانہ شینگی اور عقیدت ہر حرف سے مترشح ہوتی ہے

شریکِ غم ہمارا کون وقتِ بیکسی ہوگا مگر ہاں ایک پیر اپنا فقیر قادری ہوگا محبت میں کسی دن جان جائے گی یہی ہوگا غمِ ہوگا نہ دم ہوگا نہ ہم ہوں گے نہ جی ہوگا فقیرِ قادری کے ہاتھ ہوگا قادری جھنڈا غلامِ قادری زیرِ لوائے قادری ہوگا جس کے کرم سے لطف کے سب کام بن گئے وہ کون تھا وہ مقتدرِ کار ساز تھا ہماری بات جب پوچھی غلامِ پیر نے پوچھی ہمارے کام جب آئے فقیرِ قادری آئے



بہارِ آئی چلے پیما نہ ساقی رہے قائم ترا میخانہ ساقی  
ادھر بھی بارشِ ابرِ کرم ہو گھٹا آئی سوئے میخانہ ساقی

یہ چند شعر جو یاد آتے چلے گئے لکھے گئے، ورنہ نعت و منقبت کا حصہ تو ان کے کلام میں سب سے زیادہ ہے جس کا قول یہ ہو کہ ”حقیقی عاشقانہ شاعری تو نعت و منقبت میں ہی ہو سکتی ہے“ اس کا تو بہار یہ کلام بھی نعت میں ہی شمار ہو سکتا ہے۔ ایسے اشعار کو چھوڑ کر جس میں کچھ ایسے الفاظ آ گئے ہوں جنہیں وہ آداب نعت کے منافی سمجھتے تھے، سب کو نعت و منقبت کہا جاسکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی کئی ضخیم جلدیں مولوی نثار احمد قادری صاحب نعت خواں کے پاس صرف لطف کے کلام کی ہیں جن کی وہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔

عرس قادری تو بطور خاص موسم شعر و نغمہ ہوتا تھا۔ ہر موقع پر تازہ بتازہ تصنیف ہوتی۔ معاصرین سے مسابقت رہتی، ہر ایک عرض ہنر کرتا۔ اس سلسلہ میں مولوی نثار احمد قادری صاحب نعت خواں نے بیان کیا کہ ”چادروں کا جلوس آ رہا تھا، مدرسہ قادریہ کے سامنے جماؤ ہوا۔ سب نعت خوانوں نے باری باری پڑھا، مولوی محمد حسین قادری صاحب نعت خواں بازی لے گئے۔ انھوں نے اقبال کی غزل ”حجاز میں، نماز میں“ کی زمین میں مولانا ضیاء القادری کی غزل منقبت پڑھی۔ سماں بندھ گیا، میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا، اس لئے مجمع سے نکل کر ایک طرف کوچل دیا۔

مفتی جی نے دیکھا تو لپکتے آئے، فرمایا ”کہاں جاتا ہے؟ اب تیری باری ہے“۔ میں نے ”کہا میں نہیں پڑھوں گا، میرے پاس اس غزل کا جواب نہیں ہے“، وہ سمجھانے لگے ”کیا ہوا، تیرے پاس اس سے بھی اچھی غزلیں ہیں“، بتاتے رہے ”وہ غزل پڑھ، اچھا وہ غزل پڑھ“، مگر میں نے ایک نہ مانی اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ مفتی جی پیچھے پیچھے سمجھاتے چلے آئے۔ جلوس پیچھے رہ گیا، ہم درگاہ قادری کے قریب قاضی حوض پر پہنچے تو مفتی جی کو میری ہٹ پر جلال آ گیا، فرمایا ”نکال پنسل کاغذ“، میں تو یہی چاہ رہا تھا، پنسل کاغذ لے کر قاضی حوض کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور شعر کہنا شروع کیا، ابھی دو چار شعر ہی ہوئے تھے کہ جلوس آ پہنچا، وہ شعر مجھے دیئے اور فرمایا ”تو پڑھنا شروع کر میں اور شعر دیتا ہوں“۔

جلوس چادر درگاہ قادری کے دروازے پر پہنچا، میں نے پڑھنا شروع کیا، میں دو شعر پڑھنے نہ پاتا کہ مفتی جی اور شعر دیدیتے۔ اس طرح وہ غزل کہتے گئے میں پڑھتا گیا، ایک سماں بندھ گیا۔ ساری اگلی پچھلی کسر نکل گئی اور جب میں نے یہ شعر پڑھا ہے

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں تب تو سارے مجمع پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ احسن میاں صاحب (حضرت احسن مارہروی) دروازے کی دہلیز سے اترے، میرا منہ چوما اور اپنی شال اڑھا دی۔

یہ واقعہ بھی ان کی قادر الکلامی اور بدیہہ گوئی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

مفتی لطف علیہ الرحمۃ کی یہ خصوصیت بھی ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے کہ وہ دوسروں کی پردہ پوشی کرتے اور اپنی اصلاح فوراً کر لیتے۔ اسی غزل میں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ حضرت اقدس (حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری بدایونی) کا لفظ قبول کر لیا اور دوسری جگہ خود ہی تصحیح کر لی۔ حضرت اقدس نے پوچھا، مفتی جی

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں ”ہماری بزم خیال“ کی بجائے ”کسی کی بزم خیال“ کیسا رہے گا، وہ کھل اُٹھے اور فرمایا ”بیشک کسی کی بزم خیال زیادہ بہتر ہے“۔ پھر حضرت اقدس نے پوچھا مفتی جی وہ کیا شعر ہے ”مہر قبولیت“۔ مفتی جی نے فرمایا ”کون کہتا ہے؟ مہر حق قبول ہے“، مفتی علیہ الرحمہ نے جلدی میں ”مہر قبولیت“ لکھ دیا تھا۔ حضرت کے پوچھنے پر فوراً غلطی سمجھ میں آ گئی، سہو ہو گیا تھا۔ ”قبول“ خود مصدر ہے، ت مصدری بیکار ہے، اسی لئے کہ ابھی اعتراض واضح بھی نہیں ہوا تھا، انھوں نے فرما دیا ”کون کہتا ہے؟ مہر قبول حق ہے“

تری ذات کا تو ہے ذکر کیا ترے ذکر کا ہے یہ مرتبہ کہ بجائے مہر قبول حق ہے درود تجھ پہ نماز میں ایک واقعہ برادر محترم مولوی سید حسن حیرت قادری صاحب نے سنایا کہ ”بدایوں میں ایک مشاعرہ تھا، ہم بھی گئے ہوئے تھے، شریک ہوئے۔ ایک بزرگ شاعر نے عربی سے ناواقفیت کی بنا پر ایک قافیہ غلط باندھا، ہماری ”رگِ علامیت“ پھر کی اور ہم نے داد دی سبحان اللہ کیا قافیہ باندھا ہے مکرر ارشاد، وہ بزرگ شاعر ”مکرر ارشاد کرنے والے تھے“ کہ مفتی جی نے بھڑ بھڑا کر کہا ”آگے پڑھو، دوسرا شعر پڑھو“ اور انھیں بچا لیا۔ مشاعرے کے بعد جب ان بزرگ نے مفتی جی سے پوچھا کہ ”وہ صاحب داد دے رہے تھے، تم نے شعر مکرر پڑھنے نہیں دیا، کیوں؟“ مفتی جی نے کہا ”وہ مدرسہ قادریہ کا طالب علم ہے، تمہیں پھانس رہا تھا، لفظ غلط ہے“۔ پھر ہم سے ملے تو

فرمایا ”بری بات ہے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں“۔

مفتی لطف علیہ الرحمۃ نے بے شمار کہا ہے لیکن طبیعت بے حد لالہ بالی قسم کی تھی، اس لئے سب کلام یقیناً محفوظ نہ ہوگا۔ نعت و مناقب کا زیادہ تر کلام مولوی ثار احمد قادری صاحب نعت خواں درگاہ قادری کے پاس محفوظ ہے، جس میں ہر موقعہ کے لئے کلام موجود ہے۔ آج بھی اس کی تازگی میں کوئی فرق نہیں۔ دو سال پہلے کی بات ہے، میں نے عرس قادری میں تازہ رخصتی پیش کی۔ اس کے بھی موجد بھیا ولی (مولوی ولی الدین چشتی قادری خلیفہ زادہ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہما) اور مفتی لطف ہی ہیں، جب رخصت کے بعد تبرکات کا جلوس مکان کے دروازے پر پہنچا تو مولوی ثار احمد صاحب نے رخصتی شروع کی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں ابھی درگاہ قادری میں رخصتی پڑھ کر آ رہا ہوں، یہ انھیں کہاں ملی، ذرا غور سے سنی تو محسوس ہوا کہ اسی زمین میں یہ دوسری رخصتی ہے۔ میں نے بیاض میں جھانکنا چاہا تو انھوں نے چھپالیا، مگر مقطع میں تو بہر حال لطف موجود تھا۔

مولانا مفتی حسین احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ (برادر بزرگ حضرت مولانا فضل احمد قادری علیہ الرحمۃ کے بڑے صاحبزادے جو مفتی لطف کے تھے تو بھتیجے گو بڑے بھائی کے جانشین ہونے کی بنا پر مفتی جی اور چچا بھی انھیں بڑے بھائی ہی کہتے تھے) نے دود یوان (ایک بہاریہ اور ایک نعت و منقبت کا) مرتب کر دیئے تھے، جن پر قبضہ کرنے کی میں سوچتا رہی رہا اور بیگم منزل حسین (مفتی حسین احمد مرحوم کی صاحبزادی) لے اڑیں۔ میری چھوٹی مفتیہ (مفتی مذکور کی پوتی) نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دود یوان حفاظت سے رکھے گی اور نقل مجھے دے گی۔

مفتی لطف علیہ الرحمۃ نے مشق سخن میں جو پا پڑیلے تھے، اپنے شاگردوں سے وہ اس کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے آسان ہدایات دیتے تھے کلام کی اصلاح سے زیادہ فکر کی اصلاح کا خیال رکھتے تھے۔ مثلاً شاگردی کی شرائط کے طور پر مجھے یہ ہدایتیں دیں کہ مصرع کا غز پر نہیں لکھو گے دماغ میں شعر مکمل کرو گے۔ شعر مکمل ہو جانے پر سوچو گے کہ تمہارا کوئی ساتھی جو علم اور عمر میں تم جیسا ہے اس بات کو اسی طور پر کہہ سکتا ہے یا نہیں، اگر محسوس کرو فلاں بھی کہہ سکتا ہے تو اس شعر کو اس وقت تک اپنا نہ سمجھو گے جب تک مضمون یا طرز ادا میں ایسی ترمیم نہ کر لو کہ وہ

شعر تہارا بن جائے۔

چچا (مولوی مفتی کرم احمد قادری میخوار علیہ الرحمۃ) نے سنایا کہ مدرسہ قادریہ کی مسجد میں امامت پھوپا صاحب (مولانا حکیم سراج الحق قادری ابن مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی) یا میاں حضرت (حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری) کیا کرتے تھے۔ جب یہ منصب مولانا صاحب (حضرت مولانا عبدالمتقن مطیع الرسول قادری) کو ملا اور ان کی اقتدا میں سابق کے اماموں نے نماز ادا کی تو میاں حضرت (حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری) نے فرمایا ”مولانا امام الائمہ ہو گئے“۔ یہ روایت کان میں پڑی ہوئی تھی جب مفتی لطف کے شاگردوں کے بھی شاگرد پیدا ہو گئے تو دل سے آواز آئی ”میرا استاذ استاذ الاساتذہ ہے“۔ جب سے ہی ہم مفتی لطف علیہ الرحمۃ کو استاذ الاساتذہ کہنے لگے۔ اس میں ان کے ساتھ عقیدت کے علاوہ ممکن ہے جذبہ خود ستائی بھی کار فرما رہا ہو۔ بہر حال ہم میں جو استاذ بھی ہیں وہ استاذ الاساتذہ کی شاگردی کے طفیل میں ہی ہیں۔



## عید اور عیدی

عید خوشی و مسرت کی ایک لہر کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ اس کے معنی لوٹنے کے ہیں، عود اس کا مادہ ہے، رجوع اس کے معنی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یوں تو ساری کائنات اور اس کی ہر آن و ساعت مالک کے کرم کا مظہر ہے۔ مگر بعض شہور و ایام کو خصوصیت حاصل ہے اور وہ ممتاز ہیں، رجب شہر اللہ ہے اس میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے متوجہ رہنا استغفار ذنوب میں مشغول رہنا دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں زیادہ پسندیدہ ہے۔ شعبان کو آنحضرت ﷺ نے اپنا مہینہ فرمایا ہے، اس میں درود و سلام کی کثرت و برکات کے حصول کی ضامن ہے۔ رمضان کو امت کا مہینہ فرمایا ہے یعنی اس میں مسلمان اپنے فرماں بردار ہونے کا عملی ثبوت پیش کریں اور باوجود استطاعت ان تمام اجازتوں سے پرہیز کریں جو انھیں حاصل ہیں رمضان میں مسلمان دنیا کو دکھاتے ہیں کہ اسلام سب کے لیے مساوات کا عملی پیغام ہے، غنی و مفلس کی تفریق تعمیل حکم میں ممکن نہیں، اسلام نے جو معیار برتری مقرر کیا ہے وہ صرف تقویٰ ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے مکرم سب سے متقی ہے) اور اس کے مظاہرہ کا بہترین زمانہ ماہ صیام ہے۔ منہ بند ہیں، نگاہیں جھکی ہیں، کان محفوظ ہیں، قرہ عینی فی الصلوٰۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کا اہتمام ہے، افطار و اسحار میں کلمات شکر لب پر جاری ہیں، دل انوار ایمانی سے لبریز ہیں۔

مسلل تین مہینہ تزکیہ نفس اور خشیت الہی سے دلوں کو مجلہ کرتے رہنے کا انعام ہلال شوال کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ قید و بند کے امتحان میں پورے اترنے والوں کو اجازت عام کی طرف لوٹنے اور نعم الہی سے متمتع ہونے کا موقع میسر آتا ہے جس سے قلوب میں مسرت کی لہر دوڑ

جاتی ہے، چہرے دمک اٹھتے ہیں، درو دیوار سجتے ہیں، بہترین لباس پہنے عطر میں بے بسائے تکبیر کہتے ہوئے حکم کے بندے نماز شکرانہ ادا کرنے مصلیٰ کی طرف خوشیاں مناتے ہوئے مستانہ خرام ہوتے ہیں، یہی عید ہے۔

عید اور اس کی خوشیاں انعام الہی کی طرف لوٹنے کا نام ہے مگر یہ تمام نعمتیں جن سے متمتع ہونے کی ہمیں دنیا میں اجازت ہے، ان انعامات الہی کے مقابلہ میں دریا کا ایک قطرہ بھی نہیں جو مقررین بارگاہ کوعیش دوام میں دیئے جاتے ہیں۔ ما تشتهيہ الا نفس وتلد الا عين (جس کو جی چاہے اور آنکھیں پسند کریں) کا دائرہ کتنا وسیع ہے اس کا تصور بھی ادراک سے باہر ہے اور پھر ان سب سے بڑھ کر ”زیادہ“ کا انعام خصوصی بھی ہے جس کی تعبیر و تشریح کیسے کی جائے جبکہ اس کی تفسیر میں اس جمال کا نظارہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کی شان یہ ہے کہ لا تدرکہ الابصار (نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں)۔

علاقہ دنیوی سے منہ موڑ کر جب پاک روح منزل قرب کی طرف لوٹی ہے تو اسے کتنی خوشی نہ ہوتی ہوگی کہ سب سے بڑا انعام پانے کا وقت آیا، اس لیے مرد مومن کے لیے حقیقی عید تو پیام موت ہے یا ايتها النفس المطمئنة ارجعي الى ربك راضية مرضيه (اے مطلق جاں اپنے رب کی طرف خوش بہ خوش لوٹ جا) واپسی کا یہ حکم کتنا روح افزا ہے اور جب کہ اسی کے ساتھ فساد خلی فی عبادی و ادخلی جنتی (میرے بندوں اور میری جنت میں داخل ہو جا) کا فرمان بھی ہے جہاں عیش مٹلد اور بڑے بڑے انعامات اس کے لیے مہیا ہیں، اس مژدہ جاں فزا کون کر جو خوشی میسر آتی ہے اس پر لاکھوں عیدیں قربان ہیں حکیم امت علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے۔

نشانِ مرد مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم برب اوست  
ہم وابستگان در دولت سرائے قادری کے لیے ماہ شوال عید ہی عید ہے۔ ایک وہ عید جو ہر مسلمان کے لیے روزہ داری کے کامیاب انجام کا انعام ہے۔ دوسرے یہی وہ مبارک ماہ ہے جس کی گیارہ تاریخ کو ہمارے حضرت اقدس (عاشق الرسول عبدالقدیر بدایونی) قدس سرہ کے ظہور

سے جلوہ ہائے فضل رسول عیاں ہوئے جس کی بشارت اٹھائیس سال پہلے دی جا چکی تھی۔ ۱۲۸۳ھ جمادی الاخریٰ کی ۱۱/ تاریخ حضرت تاج الفحول عبدالقادر محبت رسول فقیر قادری قدس سرہ کا کاشانہ صاحب اقتدار کی جلوہ باری سے جگمگا اٹھا، حضور سیف اللہ المسلمول معین الحق فضل رسول قادری قدس سرہ کی خدمت میں نومولود کی خوشخبری پیش کی گئی، انھوں نے دو تعویذ عطا فرمائے اور فرمایا ایک ان صاحبزادہ کے گلے میں ڈال دو، ان کا نام عبدالقادر مطیع الرسول قادری رکھو۔ تاریخی نام غلام پیر تجویز ہوا پھر فرمایا دوسرا تعویذ محفوظ رکھو دوسرا لڑکا پیدا ہو تو اس کے گلے میں ڈال دینا، ان کا نام عبدالقدیر عاشق الرسول قادری ہوگا۔

۱۱/ ارشوال المکرم ۱۳۱۱ھ کو ۱۲۸۳ھ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور حضرت اقدس واعلیٰ رواق فزائے عالم ظاہری ہوئی، یہ دہری عید ہے کہ ہمارے تیرہ دلوں کو عشق کے سوز نورانی سے اجالنے والا اسی عید کے مہینہ میں تشریف لایا۔

یہ تو ہوئی سب کی عید اور ہم وابستگان دامن کی عید، اس سے بڑھ کر عید خود ان کی عید ہے، حضرت اقدس واعلیٰ قدس سرہ کے دیدار سے جو آنکھیں مشرف ہوئیں ہیں وہ گواہ ہیں کہ درون سینہ سوز عشق رکھنے والا ہمیشہ سراپا حسن نظر آیا ہے، لطف بیکراں نے ہر طرف پھول بکھیرے ہیں، ان کی شخصیت کے گل و گلزار ہونے کا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا ہے جنھیں حسن عقیدت سے حصہ نہیں ملا، غرض کہ ۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگریم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست  
کی کامل جلوہ گری کا مشاہدہ سب نے کیا ہے۔ حتیٰ کہ بیماری کی تکلیف میں بھی ان کی ادائے تبسم مضطرب قلوب کی ڈھارس بندھاتی رہی۔

یہ گدائے خاک نشیں دکن دیس میں رہتا ہے، بظاہر سیٹروں میل دور لیکن الحمد للہ توجہات سے قرین رہا ہے، عرس قادری میں حاضری کا حکم پہلے ہی آجاتا اور درگاہ قادری میں نغمہ سرائی کی عزت بخشی جاتی اور جب بعد عرس قادری واپسی کے لیے قدمبوس ہوتا تو فرمایا جاتا ”کمزوری بڑھ رہی ہے اللہ کا شکر ہے تمہیں دیکھ لیا نہ معلوم پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے“، بظاہر یہ کلمات زندگی سے



ناامیدی ظاہر کرتے تھے مگر جب چہرے پر نگاہ پڑتی تھی تو اس جاں فزا تبسم کو دیکھتے ہی عرض کرتا تھا ”ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا، ابھی آپ کو کچھ نہیں ہونے کا، مسکراتے ہوئے فرماتے ”تمہیں غیب کا علم ہے؟“ عرض کرتا ”وہ تو نہیں ہے مگر حضرت تاج الفحول قدس سرہ نے آپ کے لیے جو دعائیں اور التجائیں سرکارِ قادریہ میں کی ہیں دل ان کے قبول کیے جانے کا یقین رکھتا ہے“۔

یہ سلسلہ بھی برسوں جاری رہا، یہاں تک کہ میں نے خواب دیکھا کہ مدرسہ قادریہ میں مدینہ شریف کا جو نخل ہے وہ کٹا ہوا دالان میں پڑا ہے جہاں حضرت اقدس قدس سرہ تشریف رکھتے تھے، خواب میں ہی میں اپنی عادت کے مطابق غصہ کرنے لگا کہ یہ کس نے کیا، سامنے سے مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا فلاں نے یہ درخت کٹوا ڈالا، آنکھ کھلی تو دل بے چین تھا فوراً یہ خواب لکھ کر تعبیر طلب کی جس کا جواب نہ ملا، والا نامہ آیا تو یہ ”بعد عید میں بغداد چلا جاؤں گا تم تیار رہو“ یہ اشارہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

رمضان کی آخری تاریخ تھی، فجر کے بعد میں سو رہا تھا۔ کالج کی چھٹی تھی کہ حضرت شیخ سیدنا و مولانا عبدالحمد محمد سالم قادری دامت برکاتہم کا تار آیا ”باوا خطرے میں ہیں فوراً پہنچو“ اس کے بعد دل کا کیا حال ہوا، عید کا چاند دیکھنے کا ہوش کسے تھا، چل پڑا۔ مقرر اسے ریل چھوڑ کر بس سے بھاگا اور قدمبوس ہوا، آنکھیں کھول کر دیکھا رخسار پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، ناکمل جملے میں خیریت پوچھی میں نے اطمینان دلایا اور اجازت لے کر درگاہ قادری میں حاضری دے کر پھر قدموں میں آ بیٹھا۔

شرم رکھ لی مری میرے اللہ نے ہاتھ دامن عبدالقدیر آ گیا بعد عشا حضرت تاج الفحول قدس سرہ کے دواوین منقبت سنانے بیٹھا، حضرت اقدس کی آنکھیں اشک بار رہیں مگر زبان سے کچھ نہیں کہا، سب سو گئے میں خدمت میں حاضر رہا جی چاہا کچھ عرض کروں مگر دیکھا کہ حضرت اقدس نے کروٹ لے لی ہے سانس سے بالکل تندرست آدمی کے سونے کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، اس لیے ادب سے بیٹھا رہا فجر پڑھ کر سلام کو حاضر ہوا تو دیکھا مرتعش ہاتھ اٹھا کر انگشت شہادت لبوں پر رکھی پھر کان پر لے گئے، میں جان گیا فرض کے بعد

حصار قادری کا معمول پورا فرما رہے ہیں۔

بجز اس کے کہ گفتگو نہیں فرما رہے تھے، ہوش و حواس میں اختلال کا کسی قسم کے شائبہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا، غذا دوا کے لیے کہا جائے تو اسے استعمال کر لیتے تھے، ہر ایک کی آواز سنتے تھے پہچانتے تھے مگر نہ معلوم کیا کیفیات تھیں کہ گفتگو بند کر دی تھی، ایک تو اس وقت جب کہ میں پہنچ کر قدم بوس ہوا خود سے آنکھیں کھول کر دیکھا اور خیریت پوچھی یا پھر ۳ شوال کو جس وقت سول سرجن ڈاکٹر خاں صاحب آئے انھوں نے معائنہ کیا اور پوچھا ”مولانا صاحب کیا تکلیف ہے؟“ تو اس کے جواب میں ایک لمبی سانس کھینچی اور ”یا معبود“ فرمایا اور یہی آخری لفظ تھا جو خدام نے حضرت اقدس سے سنا۔

سب جانتے ہیں کہ تندرستی یا بیماری کسی حالت میں چہرے سے کسی قسم کی تکلیف کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن آج جو کیفیت نمایاں تھی اس میں کرب ہی کرب تھا، رنگ متغیر ہو ہو جاتا، وہ کیفیت نگاہوں کے سامنے تھی جس کی طرف حضرت تاج الفحول قدس سرہ نے اشارہ فرما دیا تھا:

بہت بے چین ہے مضطر ہے طائر روح عاشق کا

ہے اس کو رند پر آشوب اب مثل قفس یا غوث

وقت موعود قریب آگیا اور جیسا کہ قاعدہ ہے ۔

موعود وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

روح پر نور پر فرقت کا ایک ایک پل گراں تھا، رفیق اعلیٰ کے قرب کے لیے سوز دروں بڑھتا جاتا تھا، شوق کی گرمی میں پیشانی سے عرق رواں تھا، یہ گدائے خاک نشیں پٹی پکڑے زمین پر بیٹھا تھا، حضرت شیخ دامت برکاتہم میرے پاس استادہ تھے، ان کے پیچھے حضرت اماں جان صاحبہ مدظلہا کھڑی تھیں، حضرت اقدس قدس سرہ نے آنکھیں کھولیں بھر پور نگاہیں مجھ پر ڈالیں، ایک لفظ بھی فرمایا نہیں مگر میں سمجھ گیا کہ آخری سنت ادا فرمانا چاہتے ہیں میں نے پلٹ کر محترمہ اماں جان صاحبہ سے عرض کیا باوا کی مسواک کہاں ہے؟ انھوں نے اپنے دانتوں میں دبا کر مجھے دیا اور میں نے حضرت اقدس قدس سرہ کے دانتوں میں مسواک کی۔

مسواک کے جو فوائد بیان کیے جاتے ہیں ان میں نزع کی تکلیف میں کمی بھی ہے چنانچہ آنحضرت روجی لہ الفد ﷺ نے قریب وصل رفیق اعلیٰ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسواک طلب کی تھی اور انھوں نے اسے اپنے دانتوں سے نرم کر کے دیا تھا یہ سنت بھی ادا ہوگئی۔

میں ذرا ضروریات سے فارغ ہونے اور تازہ وضو کرنے کے لیے کمرہ سے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے پکارا ”ارے مولانا اٹھ کر بیٹھ گئے“۔ فوراً پلٹ کر آیا تو دیکھا حضرت اقدس قدس سرہ بیٹھے ہوئے ہیں، دونوں ہاتھ آداب کے انداز میں اٹھے ہوئے ہیں اور گردن تسلیم ادا کر رہی ہے فوراً پشت کو سہارا دیا تو سلام کرتے ہوئے چہرہ تک بلند فرما کر گردن اٹھائی، میں نے آہستگی سے سہارا دے کر لٹا دیا، دل نے محسوس کیا اب رکنے کا کوئی سوال نہیں ہے، بلانے والے لینے تشریف لے آئے اور انھوں نے نیاز تسلیم ادا کر لیا میں جلدی سے تازہ وضو کر کے پھر پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گیا۔

حضرت شیخ دامت برکاتہم جو ابھی تک میرے پاس ہی اسی جانب تھے سیدھے بازو میرے مقابل تشریف لے آئے، انھوں نے ذکر شروع کر دیا، یہ گدائے خاک نشین بھی ذکر میں شامل ہو گیا، اب ہم دونوں کے چہرے حضرت اقدس قدس سرہ کے رخ پر نور سے تقریباً ملے ہوئے تھے، ذکر اسم ذات اور صلوات علی النبی دونوں کو ہم نے ملا لیا تھا کہ اچانک میری آنکھیں بند ہو گئیں، نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کا ایک جھماکہ ہوا، یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ روشنی باہر سے آکر ان کے سینہ میں داخل ہوگئی یا سینہ سے نکل کر بلند یوں پر پرواز کر گئی۔

پلک جھپکتے میں حسن و عشق گلے مل گئے، فراق وصل ابدی میں تبدیل ہو گیا جو چہرے پر نگاہ پڑی تو وہ چہرہ ہی نہیں تھا جسے ہم نے ساری عمر دیکھا تھا یا جسے ابھی ابھی الم فراق میں دم بدم متغیر دیکھ رہے تھے، بے اختیار میری زبان سے نکلا ”ماں آپ نے کچھ دیکھا یہ وہ نہیں ہیں جنھیں ہم دیکھ رہے تھے“، چہرے سے نور پھوٹنا محسوس ہوتا تھا جس سے میں نکلتے ہوئے بدر کامل کی تشبیہ دوں تو ایک حد تک تصور قائم ہو جائے گا مگر جو میں نے دیکھا وہ تو کچھ اور ہی تھا، مسرت و انبساط

خاطر کے جو تاثرات ہر شخص کو نظر آتے تھے، ان کے متعلق میں بغیر مبالغہ کے کہہ سکتا ہوں کہ ساری عمر اس چہرے کو مسکراتا دیکھا ہے مگر جس قسم کی مسکراہٹ ایک لمحہ میں مرتسم ہو گئی تھی ویسی شاید حیات ظاہری میں ممکن ہی نہ تھی کیونکہ زندگی کی ساری مسرتیں وہ خوشی دے ہی نہیں سکتیں جو عاشق کو لذت و صل اور وہ بھی وصل الابدی میں میسر آ سکتی ہے، دیکھتے ہی محسوس ہوتا تھا یہ ان کی عید ہے، سب سے بڑی عید۔

اس طرح ہمارے لیے اس ماہ شوال المکرم میں تین عیدیں جمع ہو گئیں، سب کی عید (عید الفطر) ہماری عید (عید ولادت) اور ان کی عید (عید وصال)، رہی عیدی تو وہ ایک رسم ہے مگر بے حد فطری، چھوٹے سلام کرتے انعام پاتے ہیں، بڑے انعام دیتے ہیں اور شفقت کرتے ہیں کیونکہ جب دل خوش ہوں تو سب کو خوشیاں ہی خوشیاں ملتی ہیں۔

مقربان بارگاہ کے یوم وصال پر جو اعراس منعقد ہوتے رہیں وہ حقیقت میں ان کی عید و صل کا جشن ہوتا ہے، یہ ان کی خوشی کی ساعتیں ہیں، ہم جو ان میں حاضری دیتے اور عرض معروض کرتے ہیں وہ ان کی عید کا سلام ہے اور جو برکات پاتے ہیں وہ عیدی ہے۔



# رغم الانف

(ڈاکٹر محمد مسعود احمد نقشبندی کے ایک کتابچہ کا تنقیدی جائزہ)

ہوا مقتدر

جناب ”پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ“ صاحب مجرم اللہ تعالیٰ سلامتی، رحمت اور برکات کئی روز ہوئے مدراس سے کسی S.T. Ali صاحب نے ایک ملفوف میرے نام اور پتہ پر بھیجا، بہت دیر تک تو ذہن پر زور ڈالتا رہا کہ مدراس میں میرا نام پتہ جاننے والے یہ کون صاحب ہیں؟ تھک گیا تو اس سے قطع نظر کی اور لفافہ چاک کیا، اندر سے ایک پرچہ تہوڑی نقوی صاحب کا ایک خط جناب کا اور ایک کتابچہ ملے، ایصال و دیعت پر نقوی صاحب کا شکریہ۔

اب آئیے اس غلط فہمی کی طرف کہ میں نے آپ کے خط کا جواب نہیں دیا۔ خط ملا ہی نہیں، جواب کس کا دیتا؟ رہا یہ امر کہ پروفیسر محمد اسحاق قریشی صاحب نے بھی خط لکھا تھا وہ بھی جواب کے منتظر ہیں تو عرض ہے کہ ان کا خط مل گیا تھا مگر ڈاکٹریٹ وہ کر رہے ہیں، میں نہیں، ان کو جوتیاں گھسنی چاہئیں، بنا بنایا نوالہ نگلنے کی عادت خراب ہے، بدہضمی ہو جائے گی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ بوڑھا ہو گیا ہوں، زبردستی کے کام کرنے کی ہمت نہیں، ورنہ میں تو ان میں تھا کہ امتحان گاہ میں بھی کسی تلمیذ کا قلم رکتے دیکھتا اور آموختہ سنا دیتا، پھر زبردستی ڈانٹتا کہ ”نالائق مجھے امتحان نہیں دینا مگر یاد ہے، تجھے امتحان دینا تھا مگر یاد نہیں، بد بخت اب تو لکھ“۔ موصوف سے تو صرف معذرت کرنی تھی، سوچا تھوڑا ناراض ہوں گے پھر بھول جائیں گے تو میں خامہ فرسائی کیوں کروں۔

غالباً خط کا جواب تو ضرورت سے زیادہ ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ کتابچہ پر نگاہ ڈالوں یہ بتاتا چلوں کہ صاحب تذکرہ عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری بدایونی قدس سرہ کا درمیان میں ذکر آئے گا تو ان کے لیے ”المولوی“ استعمال کروں گا کیونکہ ان کے برادر بزرگ اور پیر طریقت قدس سرہ نے انھیں ”مولوی صاحب“ سے ہی مخاطب کیا اور ان کے تتبع میں سبھی نے یہی کہا، پھر میں نے دیکھا کہ ہندوستان کے باہر بھی انھیں مولوی ہی کہا جاتا۔ بصرہ پر جہاز لنگر انداز ہو رہا ہے، مولوی سامنے کھڑے ہیں، جہاز ٹھہرا ہی ہے کہ ساحل پر کھڑے ہوئے سامان اتارنے والے قلیوں کی نگاہ پڑی اور انھوں نے بیک آواز نعرہ لگایا جاء المولوی (مولوی آگئے)۔

بغداد میں گیلانی خاندان کے تمام بزرگ و خورد افراد مولوی سے ہی مخاطب کرتے۔ عراق کے ایک باوقار علمی خاندان ”الواعظ“ کے تمام افراد مولوی ہی کہتے۔ عراق کے مفتی اعظم السید یوسف آل عطا رحمۃ اللہ علیہ اور امام اعظم کے مدرسہ کلیۃ الحقوق کے رئیس نعمان الاعظمی کو بھی مولوی کہتے سنا۔ مسقط کے وزیر اعظم (سابق) سلمان الدروبی بھی مولوی ہی کہتے۔

عراق کے شاہی ہاشمی خاندان کے افراد بھی مولوی ہی کہتے، صاحب الجلالۃ فیصل الاول (ملک العراق) ان کے بڑے بھائی السید علی بن حسین (ملک الحجاز سابقاً) صاحب الجلالۃ غازی الاول (ملک العراق) عبداللہ بن علی بن حسن (الوصی علی عرش العراق) کو بھی مولوی سے ہی مخاطب کرتے سنا۔ دمشق کے بڑے عالم السید عبدالقادر الاسکندرانی (مدرس الجامع الاموی) کو بھی یہی کہتے سنا، پھر القدس الشریف میں السید امین الحسینی (مفتی اعظم فلسطین) دیگر علمائے قدس اور زعماء فلسطین کو بھی مولوی سے ہی مخاطب کرتے دیکھا۔ المغرب الاقصی کے زعیم السید عبدالعزیز الثعالبی کو بھی کہتے سنا۔ مدینہ منورہ کے بڑے محدث الشیخ خضر الشنقیطی المغربی کو بھی مولوی کہتے پایا۔

یہ محرر سطور خود اپنے لیے خادم استعمال کرے گا کہ یہی اس کا فخر ہے۔

ہاں تو آؤ اب کتابچہ کی سیر کریں۔

ٹائٹل پر ہی صاحب تذکرہ المولوی کا لقب ”عاشق الرسول“ بخط عربی لکھا ہے اور اس پر صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے۔

بتاؤ تو اعد سے کچھ واقف ہو؟ خیر خادم سمجھانے کی کوشش کرے گا۔

ترکیب اضافی میں اصل تو مضاف ہوتا ہے، نسبت کی وضاحت کے لیے مضاف الیہ لاتے ہیں، پھر مرکب اضافی دونوں اجزاء سے مل کر ایک کل بن جاتا ہے، یہاں صلاۃ و سلام کا مرجع عاشق قرار پاتا ہے جو غالباً جناب کا مقصد نہیں ہوگا۔

یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کسی شخص کا نام عبداللہ رکھا جائے اور وہ عبداللہ جل جلالہ لکھے۔ وہ لکھے یا جناب لکھیں کیا فرق پڑتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ”اللہ اکبر جل جلالہ“ سے ملا عبدالقادر نے کیوں گریز کیا اور گھر گھر پناہ ڈھونڈتا پھرا۔

تذکرہ نگار کے نام ”پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ“ پر تعجب ہوا، مگر اندرونی ٹائٹل کی پشت پر ناشر کوئی ”مولانا سلمہ“ مل گئے، ان سے کہنا بے کار ہے کہ عہدہ اور سند دونوں ایک ساتھ نہیں لکھتے، وہ مولانا ہیں تو سارے قواعد ہیچ ہیں اور ناشر ہوتے ہوئے خود اپنے نام سے پہلے مولانا لکھ سکتے ہیں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنین کنند

اب انتساب تک پہنچے، اس کے متعلق بعد میں کچھ عرض کروں گا۔

اب ”اظہار تشکر“ پر نگاہ ہے، یہ عنوان کچھ عجیب سا لگا، تشکر ایک قلبی احساس ہے، لازم خود ہوتا ہے اظہار کا اس سے کیا تعلق؟ ہاں ایک صورت سے بات بن سکتی ہے، تفاعل کی ایک خصوصیت تصنع بھی ہے جب شکر مصنوعی ہو تو دکھاوے کے لیے ہو سکتا ہے اور اظہار تشکر سے احباب کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے مگر یہ جناب کا اور احباب کا معاملہ ہے، خیر ہوگا۔

اس ضمن میں جو اسمائے گرامی ہیں ان میں سے صرف دو کو پہچانتا ہوں اور ایک سے جان پہچان نہ ہوتے ہوئے نسبت محسوس کرتا ہوں۔

(۱) پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب سلمہ۔ ان سے خادم کو پہلے سے ہی شکایت ہے کہ انھوں

نے اپنی مطبوعات میں اضافہ کی خاطر میرے نانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب (۱) ایسے لوگوں کے حوالے کر دی جنہوں نے بے سرو پا حواشی سے کتاب کو مسخ کر دیا، بعد میں آنے والے تو یہی سمجھ لیں گے کہ یہ سب غلام شہر قادری کے رشحات قلم ہیں اس لیے قابل اعتبار، حالانکہ اصل کتاب سے حواشی کا کوئی تعلق نہیں، یہ سب ”می پرانند“ کی اچھ ہے۔ کتاب کا نام طغرا میں تھا، اسے پڑھنے میں دشواری ہوئی ہوگی، مغز پاشی سے بچنے کے لیے الٹ پلٹ دیا کتاب کا یہ دوسرا حصہ بھی پہلے سے مطبوعہ ہے۔ ہاں بطور مقدمہ مذاقی فتنے کی تاریخ مجھے بھائی، اسے محفوظ ہونا چاہیے تھا، آگے آنے والوں کے لیے مفید ہوگی۔

(۲) جناب عبدالحمید محمد اقبال صاحب سلمہ۔ یہ تو جان برادر ہیں، مگر جہد آزادی کے بہت بعد پیدا ہوئے، اس دور کی معلومات ان کے پاس بہت ہی کم ہوں گی۔

(۳) حکیم نصیر الدین اجمیری صاحب سلمہ۔ ان سے نیاز حاصل نہیں مگر ان کے عم محترم اور المولوی استاذ بھائی تھے، پھر خادم نے علامہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ القول الاظہر پڑھا ہے جو انہوں نے مسئلہ اذان خطبہ میں نہایت عالمانہ اور محققانہ تحریر فرمایا ہے۔

باقی حضرات خادم کے لیے غیر متعلق ہیں۔

اب فہرست نظر کے سامنے ہے۔

”افتتاحیہ“، انشاء اللہ ضرور پڑھوں گا۔

(۱) مولانا فضل الرسول بدایونی قدس سرہ۔ سیف اللہ المسلمول اور استاذ مطلق خیر آبادی

(رحمۃ اللہ علیہما) باہم یگانگت رکھتے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا نقشہ دونوں نے مل کر بنایا تھا

(خاندانی روایت)۔ مگر اس میں بے ترتیبی نے پانسہ پلٹ دیا اور استاذ مطلق کو جلاوطن کیا گیا۔

مارا دیا یا غیر میں ان کو وطن سے دور

(غالب سے معذرت کے ساتھ)

۱۔ مولانا غلام شہر قادری بدایونی کی کتاب ”مدائح حضور نور“ کا دوسرا حصہ ایوب قادری صاحب کے مقدمہ کے ساتھ ”تذکرہ نوری“ کے نام سے سنی دارالاشاعت لائل پور (پاکستان) سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کا نام ”مدائح حضور نور“ تھا لیکن ڈاکٹر ایوب قادری صاحب نے اس کو ”نور مدائح حضور“ سمجھا، اور مقدمہ میں جگہ جگہ یہی لکھا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔



(۲) مولانا فیض احمد بدایونی قدس سرہ - حضرت رسوا جہاد آزادی میں عملی طور پر شریک ہوئے، مختلف محاذوں پر نبرد آزما رہے، پھر لاپتہ ہو گئے، حضرت تاج الفحول قدس سرہ ان کا فاتحہ اپنے کشف کی بنا پر فرماتے تھے۔

(۳) محب رسول مولانا محمد عبدالقادر بدایونی قدس سرہ - حضرت تاج الفحول قدس سرہ بظاہر انگریز سے نبرد آزما نظر نہیں آتے مگر خادم جناب کو بتائے کہ وہابیوں کا رد صرف خرابی عقیدہ کی بنا پر نہ تھا، اس میں انگریز دشمنی بھی شامل تھی۔

وہابی تحریک کے مرشد سید احمد رائے بریلوی پر ایک محققانہ رسالہ شیخوپور (بدایوں) کے رئیس، فریدی صاحبزادے، نقیب کے مدیر اور اپنے وقت کے ادیب شہیر جناب وحید احمد مسعود فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اگر ممکن ہو تو ضرور پڑھنا چاہیے اس رسالہ میں یہ ثبوت فراہم کیا گیا ہے کہ وہابی تحریک انگریز کے خلاف نہیں تھی، بلکہ اسے برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

ان حضرات کا تذکرہ غالباً تسلسل روایت اور المولوی میں اس کی جلوہ گری کے لیے کیا گیا ہوگا، مگر ان تین بزرگوں کے اسما کے بعد چوتھا نام غلام پیر مطیع الرسول عبدالمقتدر قادری قدس سرہ کا ہونا ضروری تھا، کیونکہ المولوی کی شخصیت اور کردار بنانے میں انھیں کا فیض کا فرما ہے۔

سرکار مقتدر قدس سرہ المولوی کے نہ صرف برادر بزرگ تھے، مربی تھے، استاذ تھے اور شیخ طریقت تھے، المولوی میں سب انھیں کی جلوہ گری ہے۔ تفصیل میں جاؤں تو لکھتے لکھتے تھک جاؤں گا اور حق ادا نہ ہو سکے گا۔

(۴) عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی اور امام احمد رضا قدس سرہ۔ تعجب ہے کہ المولوی کے ساتھ اس نام نے کیسے جگہ پائی۔ اس کی بجائے یہ نام ہونا چاہیے تھے: باری میاں قدس سرہ (حضرت قیام الدین عبدالباری انصاری فرنگی محلی) حضور میاں قدس سرہ (حضرت سید شاہ مصباح الحسن مودودی، چشتی، امیر الجہاد، خلف الصدق حضرت سید شاہ عبدالصمد مودودی چشتی قدس سرہ صدر اہل سنت) مولانا حسرت موہانی، علی برادران، سیف الدین کچلو، مولانا سجاد بہاری (امارت شریعت) اور نواب اسماعیل خاں اور بال گنگا دھر تلک، گاندھی، آروندو گھوش، موتی

لال نہرو، ماسٹر تارا سنگھ اور المولوی کے تربیت کردہ جاں بازوں میں نکل، برادر ام اشفاق اللہ خاں شہید اور ان کے ساتھیوں کے نام بھی ضروری تھے، خیر مضمون پڑھوں گا ہی۔

(۵) عاشق الرسول مولانا محمد عبدالقدیر بدایونی قدس سرہ - یہ تو صاحب تذکرہ ہی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جناب کے احباب کی فہرست میں اگر محقق طوسی بھی شامل ہوں تو ان کے بارے میں آخر لکھ کیا سکیں گے؟ جناب نے خادم سے کوئی ربط قائم نہیں کیا، نہ مسودہ دکھایا کہ تصحیح اور ترمیم کردی جاتی اور کتابچہ معتبر ہو جاتا۔ جناب کو معلوم ہونا چاہیے کہ المولوی سے خادم کو جو قرب و اتصال حاصل ہے وہ خادم ہی کا حصہ ہے۔ المولوی خادم کے والد تو ہیں ہی، استاذ ہیں، پیر کے جانشین ہیں اور جب خادم نے حضرت شیخ سالم قادری دامت برکاتہم کے ہاتھ پر بیعت کی تجدید کری تو دادا پیر بھی ہو گئے۔

نسبتیں ہوئیں محقق چار

خادم جہد آزادی کے شباب کے زمانے میں بہت چھوٹا تھا مگر رضا کار کی وردی میں سبز نیام کی تلوار باندھے شہنشین پر موجود رہتا۔ بریلی میں ملا جلا اجلاس مولانا آزادی کی صدارت میں ہوا تھا، بعد مغرب کاروائی شروع ہوئی اور خادم صدر جلسہ کے آگے تلوار باندھے کھڑا ہو گیا تو مولانا آزاد نے خطیب الہند حضرت ابو المنصور مولانا عبدالماجد قادری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا یہ بچہ کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا مولوی صاحب کا بچہ محمد ہے، مولانا نے ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا، گود میں بٹھا لیا، غالباً ان کی گود میں ہی سو گیا، صبح آنکھ کھلی تو قیام گاہ پر تھا، تعجب ہوا کہ جلسہ میں ڈیوٹی پر تھا یہاں کیسے پہنچا؟

یہ ایک واقعہ صرف اس لیے بیان کیا کہ جناب المولوی کا تذکرہ مجاہد آزادی کی حیثیت سے کر رہے ہیں تو خادم اس میدان میں بھی ساتھ تھا مگر شاید جناب حقائق معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھتے، سوچنا تو چاہیے تھا۔

ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

۸/۷/۶۱ بھی پڑھوں گا۔

(۹) عاشق الرسول اور ڈاکٹر محمد اقبال - سراقبال عملی آدمی نہیں تھے، تحریک آزادی کی پراگندگی کے دور میں مسلم کانفرنس کے جلسوں میں نظر آئے جس کے سربراہ شفیع داؤدی اور نیرنگ تھے اور کہیں نظر نہیں آئے، مفکر تھے، سارے جہاں کا درد دل میں لیے شعر کہتے رہے۔

المولوی نے بھی مسلم کانفرنس کے جلسوں میں شرکت کی، المولوی اور اقبال میں ادب، علم اور مسلک قادری قدر مشترک ہیں، اس لیے دونوں کے تعلق پر تعجب ہونا نہ چاہیے۔

(۱۰) کتابیات - دیکھنا ہے کہ کس کتاب سے کیا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔

فہرست ختم ہوئی، بسم اللہ صفحہ پلٹنا ہوں۔

ارے یہ کیا؟ کہاں تو یہ جوش عقیدت کہ عاشق کے لیے ﷺ بے دریغ لکھا اور کہاں یہ بے توجہی کہ شروع میں اللہ کا نام ہی غائب، کہیں یہ تحریر ”ابتد“ نہ ہو جائے، وعید تو ایسی ہی ہے۔

افتتاحیہ میں زیر عنوان اقبال کے اشعار ہیں۔ اقبال کے ادبی مقام اور فکر بلند سے کون انکار کر سکتا ہے، خود قرآن نے امم سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں اسی لیے دہرائی ہیں کہ ان سے بصیرت و عبرت حاصل ہو۔

اصل مضمون شروع ہوتا ہے، ایک طبقہ میں علما سے متعلق جو خیال پایا جاتا ہے اسے جناب نے انگریزی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والا خیال کہا ہے (ملخصاً)، خادم کے خیال میں یہ درست نہیں ہے کیونکہ انگریزی حکومت تو علما کو بے حد خطرناک اور نہایت کارآمد سمجھتی تھی، جس کا ثبوت علما کو قید و بند کے مصائب میں مبتلا کرنا اور جلا وطن کرنا ہیں اور جنھوں نے تحریک ترک موالات کے خلاف کام کیا یا جنھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر گھر کے بھیدی کا کردار ادا کیا وہ حکومت کی نگاہ میں یقیناً کارآمد تھے۔

علیحدگی پسندوں کی مثال دے چکا ہوں اس سے آگے بڑھنے والوں سے متعلق معلوم کرنے کے لیے ہمدرد (دہلی) میں مولانا محمد علی جوہر کا طویل مسلسل مضمون ”ختم خواجگی“ پڑھیے ہمدرد کا فائل ضرور مل جائے گا۔

صفحہ ۷۔ درست کہ علما نے حاکموں کی رہنمائی کی..... ”خود پاک و ہند کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ

ہے۔ تاریخ کی گواہی میں ”پاک“ کا لفظ شامل کرنا خادم کی سمجھ میں نہیں آیا، یہ نوزائیدہ مملکت ابھی تاریخ نہیں بنا سکی، اس انتشار میں علما نے کیا کیا اور اسلامی احساس کو کہاں تک عام کیا، یہ تو مستقبل کا مورخ ہی بتا سکے گا۔ فی الحال تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ تجھ میں کیا بات تیرے نام ہی ہے

تو جواب بن نہ پڑے۔

اسی صفحہ ۷ پر عہد جہانگیری و عالمگیری میں جناب نے بڑے طمراق سے اسلامی انقلاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ (اسلامی انقلاب) تو خوبصورت ہے مگر اس انقلاب کا عملی دخل عہد راشدین کے بعد خادم کو تو کہیں نظر نہیں آیا، مسلمانوں نے اپنی فتوحات سے دنیا کو زیر و بر کر دیا مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد کہیں بھی اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوا، کسی نے بھی یہ نہیں کہا۔ بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یز میں

خطبہ الوداع اسلامی انقلاب کا منشور ہے بنیادی بات ”کلکم من آدم و آدم من تراب“ سے جو مساوات اور فروتنی پیدا کرنا اسلامی انقلاب کا خاصہ ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی، اگر نظر آئی ہو تو بتائیے۔ افراد کی مثال نہ دیجیے، اجتماع کی بات کیجیے کیونکہ انقلاب کا عمل عمومی ہوتا ہے۔

اسی صفحہ ۷ پر جناب نے امرا و سلاطین کا کردار خود ہی لکھا ہے، کوئی عیب ایسا نہ ہوگا جس کی نشاندہی نہ کی ہو، پھر وہ انقلاب کہاں گیا جس کا جناب نے دو بادشاہوں کے عہد میں ذکر کیا ہے۔ صفحہ ۸ علما کی اہلیت جہاں بانی کے سلسلہ میں جناب نے کسی گدڑی پوش کا ذکر کیا ہے۔ اس سے جناب کی مراد ذات سرکار رسالت ﷺ سے ہے، یا راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کی طرف اشارہ ہے تو نہایت مبہم ہے۔ خادم کے سید و مولا سرکار بغداد رضی اللہ عنہ و رحمۃ اللہ علیہ تو خود اپنے لیے فرماتے ہیں کہ صاحب رسول جس گھوڑے پر سوار ہوا اس کے سم کے نیچے جو خاک آئے عبدالقادر (رضی اللہ عنہ) اس کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔

اسی صفحہ ۸ پر افتتاحیہ (۲) کی تیسری سطر میں ہے ”خود شاہ وقت ان سے استفعا لیا کرتا تھا“، اس سطر نے خادم طالب علم کو اپنی طرف کھینچ لیا، عربی الفاظ کی کچھ معنوی خصوصیات ہوتی ہیں ان کا

علم نہ ہو تو انہیں استعمال نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

ایک مثال سے سمجھیے، ایک لفظ فائدہ ہے، اردو میں بھی رائج ہے۔ اس لفظ سے افادہ بنتا ہے تو اس کے معنی دوسرے کو فائدہ پہنچانا ہو جاتے ہیں اور اسی فائدے سے استفادہ بنتا ہے تو معنی دوسرے سے فائدہ حاصل کرنا ہوتے ہیں۔ عربی قواعد کی کتابوں میں خاصیات ابواب مستقل عنوان ہے۔

”استفتا“ (باب استفعال سے ہے جس میں طلب کے خصوصی معنی پیدا ہوتے ہیں) کے معنی فتویٰ حاصل کرنا ہیں، اس کا غد کو بھی کہتے ہیں جس پر سائل صورت مسئلہ لکھ کر کسی مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے اور فتویٰ چاہتا ہے۔

جناب کی عبارت کے معنی یہ ہوئے کہ علما کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تو وہ استفتا لکھتے اور شاہ وقت کو پیش کرتے کہ وہ (بادشاہ) بڑا مفتی ہے تاکہ وہ اس پر جواب تحریر کرے اور بادشاہ از رہ مرحمت خسروانہ یہ سوال نامہ (استفتا) لے لیتا تھا اس بیان سے علما کی غباوت اور شاہ وقت کی فقہی بصیرت ہی سمجھ میں آتی ہے۔

اسی افتتاحیہ ص: ۱۲ کی تیرھویں سطر میں ہے..... ”پاکستان مافیہا و حاضرہا (بیروت ۱۹۷۴ء) میں بھی علمائے اہل سنت و جماعت کا کوئی ذکر و فکر نہیں“۔ ذکر و فکر کا یہ استعمال کم استطاعتی کے باعث خادم کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ خیر صفحہ ۸/ آخر اور صفحہ ۹/ ابتدا میں جناب نے لکھنے والوں کی شکایت کی ہے کہ انھوں نے صرف اپنی پسند کے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی یہ حرکت مذموم ہے لیکن اس کا جواب یہ نہیں کہ جناب اور ہمیں بھی وہی روش اختیار کریں۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ موضوع میں اپنے کارناموں کے اعتبار سے جن کا ذکر کیا جانا چاہیے، سب کا ذکر کیا جائے اور بطور خاص ان شخصیتوں کو نمایاں کیا جائے جن کو دوسروں نے نظر انداز کر دیا ہو۔

مؤرخ کے لیے محدث کی خصوصیات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات کے اسباب و علل سے بھی باخبر ہو اور یہ کہ اپنے ذاتی افکار کو دخل نہ دے ورنہ اس کی تمام کوشش جانب داری کی نذر ہو جائے گی اور اس کی روایت ثقاہت سے گر جائے گی۔

صفحہ ۹ سطر ۸۔ بڑا ستم ہے کہ جلی حروف میں لکھے ہوئے چھوٹی تقطیع کے اٹھائیس صفحات کے مضمون کو مقالہ کہتے ہیں اور اس میں (اپنے خیال میں) تاریخ کی ایک انجانی شخصیت کے حالات زندگی، سیاسی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ پیش کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس نوع کا مضمون اتنے صفحات میں ایم۔ اے کے ایک پرچہ کے بدل مقالے کے طور پر خادم کو پیش کیا جاتا تو نا کافی لکھ کر چلیپا زدہ واپس ہو جاتا، یہ تو مابعد کتورات تحقیق اینق ہے، اسے کیسا ہونا تھا، یہ ایک پروفیسر کو خود ہی سمجھنا تھا۔

اسی صفحہ ۹ پر جناب نے جہد آزادی سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف تحریک پاکستان کو ہی پیش نظر رکھا ہے، اس کے علاوہ اصل تحریک حریت کا کوئی ذکر نہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی متحدہ طور پر لڑی گئی۔ مغل حکومت کے دور میں اتحاد ویسے ہی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، اس کے بعد انگریز نے افتراق کے بیج بوئے، پہلے زبان کو تقسیم کیا، سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج نے اُردو ہندی کو علیحدہ علیحدہ زبانیں بنایا، مگر اتحاد کا کرشمہ کہ میرامن اپنی کتاب کی زبان کو ہندی ہی کہتے ہیں۔ زبان کی تقسیم کے بعد قوم کو جو پہلے ہی سے طبقتوں میں منقسم تھی فرقوں میں بانٹ کر اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط کی۔ خادم مورخ نہیں، شہور و سنین کی تصریح کا مطالبہ نہ کیجیے، ادب کا طالب علم کہانی ہی سنا سکتا ہے مگر واقعات حقائق ہوں گے، زیب داستاں نہیں۔

ہندوستان پر مکمل طور پر تسلط ہو جانے کے بعد فرقوں کے مفکروں نے اپنے اپنے فرقہ کے لیے فلاحی و اصلاحی تحریکیں چلائیں مگر ان میں کوئی بھی تحریک حریت کہلانے کی مستحق نہیں، کیونکہ حصول آزادی کے لیے متحدہ اجتماعی کوشش ضروری تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی بار اتحاد کا مظاہرہ ترک موالات کی تحریک میں ہوا جس میں آزادی ہند کے ساتھ خلافت کا معاملہ بھی شامل تھا، یہ دور بڑا جرات آزماتا تھا، مگر متحدہ صفوں میں کوئی شکاف نہ تھا۔ خادم کی کھلی آنکھوں نے دیکھا ہے کہ عرس اجیر کے اجتماع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اکبری مسجد میں حضرت مولانا قیام الدین

عبدالباری قدس سرہ کی صدارت میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں علمائے کرام اور زعمائے عظام کے ساتھ بلبل ہند مسز سروجنی نانڈو بھی شریک تھیں۔ حصول آزادی (جسے اس زمانے میں سوراج کہتے تھے) کے آثار صاف نظر آ رہے تھے، انگریزی مال کے مقاطعہ کے زیر اثر انچسٹریکٹوں کی چمبیوں نے دھواں اگلنا چھوڑ دیا تھا، حکومت پریشان تھی، مگر نہ جانے کیا ہوا کہ چوراچوری کے بعد گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی، جس سے حریت پسندوں کو دھچکا لگا، بہت لوگ بددل ہو گئے، بدظنی عام ہوئی، کتنے ہی کہتے سنے گئے، ارے یہ کیا۔

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا  
نہرو رپورٹ اور چودہ نقاط نے اتحاد کی فضا کو دفن ہی کر دیا، اس کے بعد وہ کشمکش شروع ہوئی  
جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہو گیا اور اس کا نتیجہ بھگتنا مقدر بن گیا۔  
صفحہ ۱۱ سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔

المولوی کی شخصیت کا پس منظر دکھانے کے لیے سیف اللہ المسلمول قدس سرہ کا نام سب سے پہلے لکھا ہے اور ان کو شیخ الاسلام لکھا گیا ہے۔ بابا! تم آداب سے نا آشنا معلوم ہوتے ہو، تم ہی کیا جو القاب کے پیچھے دیوانے ہیں، سب کے یہاں بے راہ روی عام ہے۔  
”شیخ الاسلام“ کا لقب ابن تیمیہ کے لیے مشہور ہے، ہم خدام اس کا استعمال اپنے سید و مولا غوث اعظم محی الدین رضی اللہ عنہ و رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بھی نہیں کرتے، یہ تو ان کے مست مئے عشق ہیں۔

خادم تو ان کے لیے مولانا کا چلتا ہوا لفظ بھی پسند نہیں کرتا، وہ جس عصر میں تھے اس میں بڑا عالم ”ملا“ کہلاتا تھا، ان کے اساتذہ کرام ملا نور، ملا انوار اور ملا بحر العلوم (قدست اسرار ہم) سب ملا تھے۔ فیض استاذ سے وہ بھی بلند مرتبہ علمیہ پر فائز تھے، اس لیے ملا ہوئے۔  
سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی) کم از کم آداب شناس تھے۔ حیات شبلی میں شبلی کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی کا نام لکھ کر حاشیہ میں وضاحت کی ہے کہ مولانا (شبلی) بہ دو واسطہ ملا فضل رسول بدایونی کے شاگرد ہیں جو بہ دو واسطہ ملا بحر العلوم کے شاگرد ہیں (مفہوم)

صفحہ ۱۲ پر ”سلسلہ عالیہ قادریہ وچشتیہ..... حاصل تھی“ یہ درست نہیں بلکہ وہ تمام سلاسل قدیمہ و جدیدہ آل احمدیہ میں مجاز بیعت تھے۔

اسی صفحہ ۱۲ کی تیسری سطر میں ”رہے“ کا استعمال عجیب ہے۔ ”بیعت ہوئے اور علم و تصوف کے اسرار و معارف سے واقف رہے“۔

اسی صفحہ ۱۲ کے حاشیہ میں ”شاہ وقت استفتا لیا کرتے تھے“ کا اعادہ ہے جس کے متعلق تفصیل سے سمجھا چکا ہوں۔

اور اکمل التاریخ لکھنے والے کا نام غلط ہے، ان کا نام یعقوب حسین تھا اور ضیا تخلص۔ لسان الحسان ضیاء القادری مشہور تھے۔ خادم کے برادر طریقی تھے ان کے پاس الفاظ کا وافر ذخیرہ تھا اور صرف میں احتیاط نہیں برتتے تھے مگر یہ ہرگز نہیں لکھ سکتے کہ بادشاہ وقت استفتا لیا کرتے تھے۔

اسی صفحہ ۱۲ حاشیہ ۲ میں بڑے مزے کی بات لکھی ہے ”جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی شیخ الاسلام حیات تھے۔ مسعود“، یہ دستخط شدہ کیسی عجیب بات ہے۔ کیا جناب کوئی ایسی مثال دیں گے کہ مصنف نے انتقال کے بعد کتاب لکھی ہو؟ وہ کتاب انھیں کی تصنیف ہے تو اس وقت ان کے حیات نہ ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

صفحہ ۱۳ پر استاذ مطلق خیر آبادی کا تعارف شاگرد کی نسبت سے مضحکہ خیز ہے۔ حاشیہ میں مولانا آزاد کا جو حوالہ نقل کیا گیا ہے اس میں تو اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کا استاذ مطلق سے تلمذ بطور فخر لکھا ہے نہ کہ بالعکس۔

صفحہ ۱۶ پر محبت رسول تاج الفحول قدس سرہ کو باوانور احمد اور علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہما کا تلمیذ لکھا ہے اور بیعت سیف اللہ المسلمول قدس سرہ سے لکھی ہے۔ حالانکہ انھیں تلمذ اپنے والد ماجد سے بھی تھا، الکلام السدید میں اس کا ثبوت ہے۔

صفحہ ۲۲ پر قطعہ تاریخ لکھنے والے کا نام اور عہدہ دونوں غلط لکھے ہیں۔ مولانا ضیا احمد صدیقی (رحمۃ اللہ علیہ) نام ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی ادب کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔

اسی صفحہ ۲۲ پر خادم کا نام پروفیسر عبدالہادی محمد میاں لکھا ہے، خادم کا نام محمد ہے صرف محمد،



عبدالہادی لاحقہ ہے، خادم کے ساتھ پروفیسر کا لفظ غلط ہے، خادم عربی ادب کا مدرس رہا، پہلے مدرسہ قادریہ (بدایوں) میں، پھر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) میں۔

پہلا باب ختم ہوا، اب دوسرے باب کا مطالعہ شروع کرتا ہوں جس کا عنوان ہی خادم کی سمجھ میں نہ آیا۔ جیسا کہ فہرست کے مطالعہ کے سلسلہ میں صراحت کی ہے۔

ص ۲۵ پر قصیدہ موسومہ چراغ انس میں محب رسول تاج الفحول قدس سرہ سے فاضل بریلوی یغفر اللہ لہ کا مدح سرائی کا تعلق ظاہر کرنے کے بعد جناب تحریر کرتے ہیں ”اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد عبدالقدیر بدایونی اپنے سیاسی افکار میں امام احمد رضا سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں“ سبحان اللہ کیا خوب نتیجہ اخذ کیا ہے، اوپر کے بیان میں فاضل بریلوی کی نیاز مندی کا ثبوت ملتا ہے نہ کہ المولوی کے ان سے متاثر ہونے کا۔

ص ۲۶ پر المولوی کے خطبہ صدارت سے اقتباس کہ ”ہر مسلمان بھائی کا اپنے مسلمان بھائی سے لین دین ایک ملی فریضہ ہے اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت اس احساس فرض کے بغیر درست نہیں ہو سکتی“ (مفہوم) کو مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی کسی ہدایت کے تابع کرنا بڑی جرأت ہے۔

اول تو یہ کہ یہ بات فاضل بریلوی کی ایجاد نہیں، امداد باہمی تو تاریخ اسلام کا اہم باب ہے، جس کی بنیاد عہد مداخلت کو سمجھنا چاہیے، دوسری بات یہ کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ المولوی ترک موالات کا معاہدہ ہے، جس میں انگریزی مصنوعات کا مقاطعہ بھی شامل ہے، المولوی مسلمان بھی ہے اس لیے اس نے ”شدھ کھدر“ کی بجائے ”گاڑھے“ کو پسند کیا، جو شمالی ہند میں مسلمان بنکر تیار کرتے ہیں اور گاڑھے کا لباس ہی پہنا، المولوی کے جانشین زیب سجادہ قادریہ مجید یہ شیخ سالم قادری دامت برکاتہم نے ان کی روش کے اتباع میں کفن کے لیے بھی گاڑھا ہی استعمال کیا، قول و عمل میں ایسی یکسانیت کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی جو زندگی کی سرحد بھی پار کر جائے۔

ایک خالص اسلامی قدیم نظریہ کو پیش کرنے کے جرم میں المولوی پر جناب فاضل بریلوی کی خوشہ چینی اور پیروی کا الزام سراسر بہتان ہے، اس سے جناب کی خامہ فرسائی کی حقیقی غرض آشکار

ہو گئی۔ جناب المولوی کو ”درپس آئینہ طوطی“ ثابت کرنے کے درپے ہیں، یہ بازی گری ہے کہ ذکر بظاہر المولوی کا ہے اور مدح و ثنا کسی اور کی مقصود ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا  
انتساب پڑھتے ہوئے خادم نے وعدہ کیا تھا کہ اس پر بعد میں کچھ لکھوں گا۔ جناب نے  
اپنے اس مضمون کو مظلوم علما کے نام پیش کیا ہے، واقعی اب تو المولوی اس انتساب کا مستحق ہے کہ  
مظلوم ہے اور تاریخ سے اس کے نام اور کارنامے کو مٹایا جا رہا ہے مگر یہ بھی یاد رکھیے کہ المولوی کے  
کردار کا ظلماً قتل آپ کی تحریر کر رہی ہے مگر۔  
ہرگز نمیر دآنکہ دلش زندہ شد بعشق

اب مزید ابواب کا پڑھنا کا رعبث ہے، بلی تھیلے سے باہر آگئی۔

اللهم اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب  
عليهم ولا الضالين.

گدائے خاک نشیں

محمد القادری

المدعو بہ ہادی القادری

۴۲ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ / ۲۶/۷/۱۹۸۲ء

## عرب اور سفارت

موجودہ زمانہ میں جبکہ دنیا کی پنہائیاں قرب سے بدل گئی ہیں، دور دراز علاقے ایک دوسرے سے مربوط ہو گئے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت انسانیت اور حالات سے باخبری سیاست کہلاتی ہے۔ سفارت ناگزیر ہو گئی ہے، کون سی جگہ ہے جہاں یہاں وہاں کے سفیر نہ ہوں۔ لیکن یہ تمدن کی ہماہمی کچھ ایسی قدیم نہیں، تاریخ کی دسترس میں بھی ایسا زمانہ ہے جب دنیا کے بہت سے علاقے ایک دوسرے سے قطعاً بے خبر تھے اور جو ایک دوسرے سے نزدیک تھے، جانتے پہچانتے تھے ان میں سفارتی تعلقات کی بجائے نبرد آزمائیاں گویا معمول میں داخل تھیں۔ اس لیے قدیم زمانے کے متعلق تحقیق کرنا کہ ان میں سفارت کا رواج تھا یا نہ تھا اور تھا تو ان کی سفارت کس قسم کی ہوتی تھی ضرور دلچسپی کی بات ہے۔

عرب قوم دنیا کی قدیم ترین اقوام میں شمار ہوتی ہے، اس نے بہت سے عروج و زوال دیکھے ہیں، طبقے ہلاک ہوئے ہیں اور صرف نام چھوڑ گئے ہیں یا کچھ حکایات، یہاں تک کہ اسلام سے پہلے کا دور بھی جاہلیت شمار ہوتا ہے کیونکہ ایسا کوئی دفتر موجود نہ تھا جس میں ان کے واقعات و حوادث اور تمدنی رسوم کو مدون کیا جاتا رہا ہو۔ ہمارے پاس باخبری کا ذریعہ ان کا ادب ہی ہے جس سے بڑی حد تک ان کے متعلق معلومات مل جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ہم پورے طور پر ان سے باخبر ہیں۔

اسلام سے پہلے کے زمانہ میں سفارت کا مفہوم سمجھنے میں ہمیں لغت سے مدد لینا پڑے گی۔ لغت میں سفیر کی تشریح یوں ملتی ہے۔ السفیر الرسول والمصلح بین القوم یعنی سفیر کے معنی نامہ براور قوم میں صلح صفائی کرانے والے کے ہیں۔ صاحب لسان العرب نے کہا ہے:

والجمع سفراء وقد سفر بینہم یسفر سفراً وسفارة اصلح یعنی سفیر کی جمع سفر آتی ہے، مصدر سفر یا سفارہ ہے اور اس سے فعل سفر یسفر استعمال ہوتا ہے جس کے معنی صلح کرانے کے ہیں۔

لغت میں سفارت اور سفیر کے معنی صلح کرانا اور صلح کرانے والا ہیں۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ عرب جاہلیت میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب دو قبیلے آپس میں لڑ پڑیں اور یہ تو روز کا معمول ہی تھا تو کچھ لوگ بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کی کوشش کرتے تھے جو سفیر کہلاتے تھے۔ سفیر کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسے مرتبہ کا حامل ہو کہ فریقین اس کی بات مان لیں، اس لیے یہ اعزاز بالطبع اس قبیلہ کو ملنا چاہیے جو سب سے معزز ہو اور سب اس کی عزت کرتے ہوں۔ کعبہ کی مجاورت نے قریش کو یہ مرتبہ بخش دیا تھا کہ وہ عرب کے عام قبائل کی طرح غیر متمدن نہیں تھے، سارا عرب ان کا احترام کرتا تھا، اس لیے قریش کو ہی دوسرے مناصب کے ساتھ سفارت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

قریش کے سردار اپنے منصب کو نباتے تھے اور جب قبیلوں میں اختلاف ہوتا اور لڑائی ٹھن جاتی تو حالات کا جائزہ لیتے اور صلح صفائی کے لیے قریشی سفیر درمیان میں آ جاتے۔ ان کی بات تسلیم نہ کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ اس طرح وہ سفیر کو اپنے خلاف کر لیتے، سب سفیر کے فیصلے پر راضی ہو جاتے۔ اسلام سے پہلے جاہلیت میں آخری سفیر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ مانے جاتے تھے۔

جاہلیت میں سفارت اور سفیر کا مفہوم یہی تھا جو لغوی معنی کے مطابق ہے اسلام کے بعد بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ سفارت کے مفہوم میں وہ اصطلاحی پن پیدا نہیں ہوا جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ تاریخ اسلام میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب فتنہ پیدا ہوا اور باغیوں نے امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بات کرنے کے لیے سفیر بنا کر بھیجا، انھوں نے خلیفہ وقت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا قد استسفرنونی بینک و بینہم (انھوں نے اپنے اور آپ کے درمیان مجھ سے سفارت چاہی ہے) صلح کا پیامبر بن کر آیا ہوں۔

سفارت کا یہی مفہوم اسلامی عہد میں کافی زمانہ تک محسوس ہوتا ہے۔ سلطنت بنو امیہ میں بھی یہی طریقہ رائج تھا، واقعہً جمل اور دوسری لڑائیوں میں جب بھی صلح کی ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے سفارت سے کام لیا، حالانکہ ان کی حکومت کافی وسیع ہو گئی تھی اور تمدن میں بھی کافی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں، مگر سفارت کے مفہوم میں کوئی اہم تغیر و تبدل محسوس نہیں ہوتا۔

بنو امیہ کے زوال کے بعد بنو عباس نے اسلامی حکومت کا اقتدار سنبھالا اگرچہ انھیں اس وسیع علاقہ پر جو پہلے دمشق کے زیر نگیں تھا پوری طور پر دسترس حاصل نہ ہو سکا، مگر تمدنی اعتبار سے بغداد نے ساری دنیا کی راہبری کی، شان و شوکت اور حکمت و سیاست میں بہت بلند مقام حاصل کیا، اس عہد میں محسوس ہوتا ہے کہ سفارت کے مفہوم میں تبدیلی آنی شروع ہو گئی۔

خبر و عافیت دریافت کرنے اور شادی بیاہ کے پیام لانے لے جانے کے لیے بھی سفیر بھیجے جانے لگے، یعنی ان کے لیے بھی سفیر کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ جیسا کہ ۲۷۹ھ کے واقعات میں ملتا ہے کہ خمارویہ بن احمد بن طولون نے عباسی خلیفہ معتضد کے پاس مصر سے ابن جصاص کو شادی کا پیام لے کر بھیجا۔ اس کے لیے بھی ارسالہ سفیراً (اسے سفیر بنا کر بھیجا) استعمال ہوا ہے۔

بغداد میں عباسی خلافت کے زمانے میں ہسپانیہ میں اموی خلافت کا دربار یورپ میں شان و شوکت، تہذیب و تمدن اور علم و فن کا مرکز بن گیا تھا، ہسپانیہ کے اموی تاجداروں کے درباروں میں بڑے بڑے سلاطین سفارتیں بھیجتے اور خود باریابی کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

اموی دور میں رومی سلطنت کے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر کئی بار حملے کیے گئے تھے اور محاصرے کیے جاتے رہے مگر جب دمشق کے سقوط کے بعد مشرق سے اموی سلطنت کا نام مٹ گیا، امویوں نے ہسپانیہ میں پناہ لے کر اپنی خلافت علیحدہ قائم کر لی تو رومی بادشاہ نے عباسی حکومت کے خلاف قرطبہ کے اموی خلیفہ عبدالرحمن اوسط کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ۲۲۵ھ میں قیصر نے ہدایا لے کر دربار قرطبہ میں سفارت بھیجی اور مشرق کو دوبارہ فتح کرنے کی طرف متوجہ کیا۔

عرب میں افتخار بالنسب عام تھا، مگر کنیزوں کا رواج بھی تھا، ان کی اولاد بھی حسب صلاحیت مراتب پاتی تھی، اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں منصب خلافت پھر بھی ایسے لوگ فائز ہو گئے۔

رومی بادشاہ نے اموی خلیفہ عبدالرحمن اوسط کی توجہ مبذول کرانے کے لیے مامون الرشید اور معتصم کے نام لکھنے کے بجائے ماؤں کے ساتھ ان کی کنیت استعمال کرتے ہوئے ابن مراجل اور ابن ماردہ لکھا، گویا وہ ان کی تحقیر کر رہا ہے کہ کنیز زادے اُسے ستاتے ہیں، عبدالرحمن نے قیصر کے ہدایا قبول کیے اپنی طرف سے بھی ہدایا کے ساتھ سفارت روانہ کی اور اپنے خاص شاعر یحییٰ کو قیصر کی خدمت میں بھیجا جس سے دونوں حکومتوں میں تعلقات استوار ہو گئے۔

بنو عباس کے زمانہ میں سفارت کا ایک یہ طریقہ بھی رائج تھا کہ تجارتی کاروبار کرنے والوں کے سپرد سرکاری خدمات بھی کر دی جاتی تھی، وہ لوگ اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی سفارت کا کام بھی انجام دے لیا کرتے تھے اور دونوں حکومتوں میں رابطہ بنے رہتے تھے، جیسا کہ تاجروں کے ذریعہ ہندو چین کے درباروں میں بغداد کے ہدایا پیش کیے جانے اور وہاں کے تاجروں کے بغداد کے دربار میں حاضر ہونے اور تحائف پیش کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

عباسی مرکز بغداد کی کمزوری کے زمانہ میں مختلف صوبے خود مختار بادشاہتوں میں بٹ گئے تھے، ان میں مصر کے فاطمین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مصر کے فاطمین کے زمانے میں بھی سفارت سے کام لیا جاتا تھا، ان کے زمانہ میں ”وساطت“ اور ”سفارت“ دو اصطلاحیں رائج تھیں و ساطت سے وہ ایسی نمائندگی مراد لیتے تھے جو عوام اور بادشاہ کے درمیان ہوتی تھی اور سفارت دو بادشاہوں کے درمیان تعلقات ہموار کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

عباسی عہد زریں میں ہی ہمیں سفارت کا وہ مفہوم ملتا ہے جو آج کل مستقل طور پر رائج ہے دوسری حکومتوں کے فرماں رواؤں کے پاس تحائف لے کر جانے والے اور حکومتوں کے تعلقات کو مضبوط بنانے والوں کو بھی سفیر کہا جانے لگا تھا۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر جس سفارت کا ذکر کیا جانا چاہیے اور جس کے بغیر عرب سفارت کی کہانی بالکل ادھوری رہے گی وہ بغداد کے عباسی خلیفہ ہارون رشید اور شار لیمان کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہے۔

شار لیمان یورپ کے ان عظیم بادشاہوں میں ہے جس نے رومن بادشاہوں کی جلالت شان کو تازہ کیا اور سلطنت کو وسعت دی، شار لیمان اور ہارون رشید کو ایک دوسرے سے قریب لانے

میں بعض مشترک مصالح نے اپنا فطری عمل کیا۔

(۱) شار لیمان کو ہسپانیہ کے اموی تاجداروں سے ہر وقت خطرہ تھا جن کے سیلاب کو روکنے میں اس کے دادا نے کامیابی حاصل کی تھی، مگر جب تک ان کی طاقت روبہ زوال نہ ہو شار لیمان کو اپنی حکومت کی سلامتی ہر وقت خطرہ میں محسوس ہوتی تھی۔

(۲) رشید کو بھی ہسپانیہ میں اموی اقتدار اپنی خلافت پر ایک بدنماداغ محسوس ہوتا تھا رشید کی بھی خواہش یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہسپانیہ کے اموی تاجداروں کا زوال ہو اور وہ علاقہ بھی دمشق کی طرح بغداد کے ماتحت صوبہ کہلائے۔

(۳) شار لیمان قسطنطنیہ کے قیصروں کو اپنا حریف سمجھتا تھا ان کی شوکت و عظمت کے زوال کا متمنی تھا۔

(۴) رشید بھی قیصرہ کی دولت سے برسر پیکار تھا اور قسطنطنیہ کو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرنے کا متمنی تھا۔

(۵) بیت المقدس کے مسیحی زائرین کو رشید سے دوستی کے ذریعہ سے سہولت حاصل ہوتی تھی۔

(۶) قیصر کے مقابلہ میں یورپ کے مسیحیوں کی مدد شار لیمان کی دوستی سے حاصل ہو سکتی تھی۔

ان امور نے دونوں عظیم بادشاہوں کے لیے ایک دوسرے سے روابط پیدا کرنا ضروری کر دیا تھا اور یہ دوستی دو ایسی حکومتوں کے درمیان ہموار ہوئی جن میں سے ایک اسلامی خلافت بغداد کہلاتی تھی جو ایک مسیحی سلطنت قسطنطنیہ سے نبرد آزما تھی اور دوسری مسیحی شہنشاہیت تھی جو ایک اسلامی خلافت (اندلس) کے خلاف جنگ آزما تھی۔ اس سے یہ بات محسوس کی جاسکتی تھی کہ دو بالکل متضاد تصورات رکھنے والی حکومتیں ایک دوسرے سے دوستی بڑھائیں۔

تعلقات استوار کرنے کے لیے شار لیمان نے سفارت بھیجنے میں پہل کی، اس نے تین رکنی سفارت روانہ کی۔ رئیس وفد ایک یہودی عالم اسحاق نامی تھا کیونکہ اس زمانہ میں یہودی ہی عرب اور یورپ کے درمیان واسطہ بن سکتے تھے، یہ لوگ عرب سے علمی تعلق رکھتے تھے اور طب وغیرہ میں مہارت حاصل کر کے یورپ چلے آتے تھے، اسحاق کے ساتھ اور فرانیسی بھی سفارت میں

شریک تھے جن میں ایک کا نام لیل فراند تھا اور دوسرے کا نام نچمان بیان کیا جاتا ہے۔  
یہ سفارت ہارون الرشید کے دربار میں باریاب ہوئی تحائف نذر کرنے کے بعد شارلیمان  
کی طرف سے استدعا کی کہ ان زائروں کے لیے جو بیت المقدس حاضر ہوں سہولتیں مہیا کی  
جائیں اور یورپی تاجروں کو حفاظت و سلامتی کی ضمانت دی جائے، رشید اس سفارت سے بہت  
خوش ہوا اور ان کی عرضی منظور کر لی، سفیروں کی واپسی پر ان کے ساتھ تحائف دے کر اپنی طرف  
سے سفارت روانہ کی۔

ہارون الرشید کے سفر جو تحفے شارلیمان کے لیے لے گئے تھے ان میں نفیس قسم کے کپڑوں کے  
علاوہ ایک زنجیر فیل (ہاتھی دانت کے بنے ہوئے شطرنج کے مہرے) اور ایک عجیب گھڑی بھی تھی  
جس کی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہر گھنٹے پر سوار گھڑی سے نکل کر گھنٹا بجا کر واپس جاتے تھے۔  
ایک بجے ایک سوار نکلتا، دو بجے دو، اس طرح چوبیس گھنٹے بجانے کے لیے چوبیس سوار نکلتے تھے۔  
تاریخ میں اس نادر گھڑی کا ذکر ”الساعة الدقاقة“ (کھٹکھٹانے والی گھڑی) کے نام سے  
ملتا ہے، جب یہ گھڑی یورپ پہنچی تو وہاں اسے جادوگری کا کمال سمجھا گیا اور لوگ اسے توڑنے پر  
تیار ہو گئے مگر شارلیمان نے انہیں ایسا کرنے سے روکا۔

ان تحفوں میں سے جو اپنے سفیروں کے ساتھ بغداد کے عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے  
شارلیمان کو بھیجے تھے اب بھی پیرس کے عجائب خانہ میں شطرنج کے کچھ مہرے محفوظ ہیں۔  
شارلیمان اور رشید کے درمیان سفارت کے تبادلے میں نہ صرف دونوں حکومتوں میں سیاسی  
اتحاد پیدا ہوا بلکہ شارلیمان کو یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی مملکت میں بھی علمی مرکز قائم ہوں، جیسے  
کہ رشید کے عہد میں عباسی مملکت میں پائے جاتے تھے مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔  
کیونکہ یورپ میں جہالت ایسی راسخ تھی کہ اس کا اچانک دور ہونا ممکن نہ تھا، شارلیمان کی کوشش  
وقت سے پہلے تھی ابھی تو دراز زمانہ تک یورپ کو جہل کی تاریکی میں رہنا مقدر تھا۔

☆☆☆



## عربوں کا فن حرب

خانہ بدوشی ان کے لیے ضروری ہو جاتی ہے جو ایسے ماحول میں زندگی گزاریں جہاں زندگی کی ضرورتیں آسانی سے فراہم نہ ہو سکیں۔ عرب کے طبعی حالات بھی عام طور پر ایسے ہی ہیں کہ وہاں پانی بھی ہر جگہ وافر مقدار میں میسر نہیں آتا۔ اس لیے جو قوم اس خطہ ارض میں آباد ہوئی اسے مجبوراً خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کرنی پڑی۔

خانہ بدوشانہ زندگی قوم میں کچھ خصوصیات پیدا کر دیتی ہے جن میں تکلیفوں کو سہنا اور مشکلوں سے مقابلہ کرنا سب سے اہم خصوصیتیں ہیں۔ عرب قوم میں جو قوت برداشت اور بہادری عام ہے حقیقت میں وہ ان کی خانہ بدوشانہ زندگی کی دین ہے، کم سے کم اور معمولی سے معمولی چیز پر قناعت کر لینا اور بات بات پر جان کی بازی لگا دینا شہری زندگی بسر کرنے والوں کے بس کی بات نہیں۔

عربوں کی زندگی ”تنازع للبقا“ کا ہدف تھی اس لیے ہر اس مقام پر قبضہ کر لینے کی خواہش عام تھی جہاں کچھ سبزہ اور پانی میسر آ سکے، کیونکہ وہ خود تو اپنے اہلی جانوروں کے دودھ پر گزر بسر کر سکتے تھے مگر جانور بغیر چارہ پانی کیسے زندہ رہتے، اس لیے مسابقت کا جذبہ عام تھا اور اسی وجہ سے مختلف قبیلے اکثر باہم دست و گریباں رہتے تھے، یہاں تک کہ لڑائی گویا ان کی فطرت بن گئی تھی۔

اگرچہ عرب قوم مسلسل لڑتے رہنے کے باعث حرب و ضرب کی عادی ہو گئی تھی لیکن چونکہ وہ خارجی دنیا سے بڑی حد تک الگ زندگی گزارتی تھی اس لیے اس کا فن حرب صرف نیزہ بازی یا تلوار چلانے کی حد تک محدود تھا، ہمیں عربی ادب میں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں نیزہ، تلوار اور ان کے استعمال کا ذکر ہوتا ہے۔

نیزہ کی تعریف یہی سمجھی جاتی تھی کہ اس کی چھڑ سیدھی، سخت اور پکدار ہو، جیسا کہ عرب کے

مشہور صاحب معلقہ شاعر عمرو بن کلثوم اپنے نیزے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔  
 اذا عض الثقاف بها اشمازت وولسه عشوزنة زبونا  
 اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیزہ کی لکڑی کو اگر جھکانے کی کوشش کی جائے تو وہ خود جھکانے  
 والے کا سر پھوڑ دیتی ہے۔

تلوار ایسی پسند کی جاتی تھی جو ہلکی پھلکی اور پکدار ہو جیسا کہ عرب شاعروں میں سب سے کم  
 عمر اور صاحب معلقہ شاعر طرفہ بن العبد کہتا ہے۔

وآلت لا ينفك كشحي بطانة

بعضب رقيق الشفرتين مهند

تلوار کے ساتھ عام طور پر تعریفی طور پر ”مہند“ (ہندستانی) استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ  
 غالباً یہ ہے کہ ہندوستان فولاد سازی میں کافی ترقی کیے ہوئے تھا اور ہندی تلوار دوسری تلواروں  
 کے مقابلہ میں زیادہ سبک اور مضبوط ہوتی تھی۔

نیزہ عام طور پر خطی پسند کیا جاتا تھا۔ ”خط“، پیام کا ایک موضع ہے جہاں کی چھڑ بہت عمدہ ہوتی  
 تھی، اس لیے نیزہ کی تعریف میں خطی کی صفت عام طور استعمال ہوتی تھی۔

عرب بہادر نیزہ بازی میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ ان کی طعن (نیزہ سے زخم لگانا) بہت  
 ہی شدید ہوتی تھی، ایک عرب شاعر اپنی نیزہ بازی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیزہ کی طعن  
 نے ایسا چوڑا زخم لگایا جیسے بھری ہوئی مشک میں شگاف دے دیا جائے۔

وطعن كفم الزق

غذا والزق ملآن

شمشیر زنی میں بھی انھیں مہارت تھی، طرفہ بن العبد اپنی ضرب کی کیسی عمدہ تعریف کرتا ہے کہ  
 ایک وار کے بعد دوسرے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، پہلی ضرب ہی قاتل ہوتی ہے۔

اخي ثقة لا ينشني عن ضربية

اذا قيل مهلا قال حازمه قدی

نیزہ اور تلوار دونوں عربوں کے محبوب ہتھیار تھے، لیکن ان کے استعمال کے مواقع علیحدہ علیحدہ تھے۔ جب مقابل سامنے آتا تھا تو دور سے ہی وہ اسے نیزوں پر رکھ لیتے تھے اور کوئی سخت جان قریب پہنچ جائے تو پر تلوار اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ عمرو بن کلثوم کہتا ہے۔

نطاعن ما ترخی الناس عنا

ونضرب بالسیوف اذا غشینا

عربوں کی نیزہ بازی مشہور ہے، وہ لانبے لانبے نیزے استعمال کرتے تھے جن کے سروں پر فولادی برچھیاں ہوتیں، عرب نیزوں کو شتر مرغ کے پروں سے سجاتے تھے، ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ دشمن کو دیکھ کر نیزہ سر کے اوپر تولتے، تھوڑی دیر ہلاتے اور پھر پوری قوت سے اسے پھینکتے، نیزہ ہوا میں اڑتا ہوا اتنی تیزی سے اپنے نشانہ پر جاتا کہ اس کی اڑان سے خاص قسم کی آواز سنائی جاتی۔

عربوں کی حربہ اندازی کا کمال اس وقت اور بھی عجیب معلوم ہوتا جب کہ وہ اپنے پیچھے دشمن کی آہٹ محسوس کرتے، بغیر پلٹے ہوئے صرف آہٹ پر پیچھے نیزہ پھینکتے اور اس وقت بھی ان کا نشانہ خطانہ کرتا۔

عرب قوم میں تکلیفیں برداشت کرنے اور اپنی قوت بازو سے ضرورتیں پوری کر لینے کی خاص ہمت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا پیشہ ہی لوٹ مار رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی وہ اس کے عادی رہے ہیں کہ ہواؤں سے بازی لے جانے والے گھوڑوں اور سائڈ نیوں پر بیٹھ کر طویل سے طویل مسافت بغیر تھکن کے احساس کے طے کریں اچانک کسی پر جا پڑیں اور اپنا کام کر جائیں۔

دور جاہلی میں بھی ان کی لڑائیوں میں ان کا حربی شعور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دشمن کو گھبرا دینے اور غیر متوقع تیزی سے حملہ کرنے کو سب اہم جنگی چال سمجھتے تھے، واقعہ بھی یہی ہے کہ جنگ میں یا تو ہتھیار کی برتری فتح دلاتی ہے یا دشمن کی سراسیمگی اسے ہزیمت پر مجبور کرتی ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کو منظم طور پر لڑائی کے میدان میں آنے کا بہت ہی کم موقع ملا تھا۔ جو لڑائیاں طویل بھی ہوئیں ان میں حصہ لینے والے دونوں جانب عرب ہی ہوتے تھے، اس لیے فن حرب میں کسی قسم کی جدتیں پیدا نہ ہو سکیں، لیکن طلوع اسلام کے بعد جب عرب اسلامی سپاہی بن

گئے تو انھیں مختلف ترقی یافتہ دشمنوں کے مقابل صف آرا ہونا پڑا، ان کے حربی شعور نے انھیں فن حرب میں جدتیں پیدا کرنے پر ابھارا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

میدان جنگ سے فرار کو ہمیشہ باعثِ ننگ و عار سمجھا گیا ہے، عرب شاعروں میں صرف تابع شرابی ایک ایسا آدمی نظر آتا ہے جو بھاگ کر جان بچالانے کا خریہ انداز میں ذکر کرتا ہے۔

إذا المرء لم يحتل وقد جد جدہ اضاع وقاسی امره وهو مدبر  
ولكن اخواله الذی لیس نازہ به الخطب الا وهو للقصد مبصر  
اس قسم کی دوسری مثال نہیں ملتی، لیکن اس سے ایک حربی نکتہ کی نشان دہی ہوتی ہے جسے بعد میں عربوں کے اسلامی لشکر نے عملی طور پر آزمایا اور اکثر کامیاب پایا۔

سر یہ موتہ میں تمام کا تمام اسلامی لشکر کٹ کر رہ جاتا اگر سیف اللہ خالد شدت سے لڑتے ہوئے تابع شرار کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق دشمن کے زرعے سے نکال لانے کی کوشش نہ کرتے۔ اس طرح انھوں نے کافی خون دوسری جگہ استعمال کرنے کے لیے بچالیا، لیکن انہیں اور ان کے ساتھیوں کو زبانِ خلق نے ”فسّارون“ (بھگوڑے) کا لقب دیا، وہ سالارِ اعظم جس کی ذات ہر اعتبار سے سب سے ارفع و اعلیٰ تھی (ﷺ) ان سے خندہ پیشانی سے ملا اور اس نے انہیں ”کسارون“ (پلٹ کر حملہ کرنے والے) کے خطاب سے نوازا کر ان کی ہمت بڑھائی، گویا فن حرب میں ”منظم پسپائی“ کو بھی شامل کر لیا گیا۔

عربوں کی تاریخی لڑائیوں میں ہمیں ان کی خاص حکمت عملی اکثر یہ نظر آتی ہے کہ وہ پہلے تو بہت شدید حملہ کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان کے حملہ کا زور گھٹتا جاتا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہٹتے پلٹ پڑتے تھے، مگر اب دشمن کے لیے پیچھے ہٹنے کا امکان نہیں ہوتا تھا کیونکہ فتح کی سرشاری میں وہ اس سے بے خبر ہوتے تھے کہ کمین گاہوں میں چھپے ہوئے محفوظ عرب سپاہی ان کے عقب پر چھائے جارہے ہیں، اس طرح شکست کو فتح میں تبدیل کر دینا ان کی خاص حربی چال ہوتی تھی۔

عربوں نے طریقہ جنگ میں ہی ایجادیں نہیں کیں جن سے مقابل سراسیمہ ہو جاتے تھے اور عددی برتری کے باوجود ہزیمت اٹھاتے تھے، بلکہ انھوں نے دوسروں پر ہتھیار کی برتری بھی

بہت جلد حاصل کر لی جس نے ان کی فتح کو یقینی بنا دیا اور بڑے بڑے مضبوط قلعوں والے اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

عرب کے بادیہ نشین درندوں سے اپنے جانوروں کی حفاظت کے لیے ”مقلع“ (گوپھن) کا استعمال کیا ہی کرتے تھے اور اس سے بھی بہت سچا نشانہ لگاتے تھے، اسی کو ترقی دے کر انھوں نے ”منجیق“ بنا ڈالی، منجیق کی ایجاد اپنے وقت پر آج کے ایٹم بم سے کم نہیں تھی، اس کی ہیبت نے بڑوں بڑوں کا جگر پانی کر دیا تھا۔

آج دنیا نیزہ، تلوار اور منجیق سے بہت آگے بڑھ گئی ہے، اس لیے فن حرب بھی نئی صورت اختیار کر گیا ہے اور وہ تو میں جو سائنس کی دوڑ میں کچھڑ گئی ہیں ان کی بہادری کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے، پھر بھی عرب قوم اپنے ویران علاقہ میں اسی شان سے رہتی ہے جیسے قدیم زمانہ سے رہتی آئی ہے۔

عرب کے بدوی نوجوان آج بھی ہر وقت مسلح رہتے ہیں، عمدہ تلواروں، چمکدار خنجروں کے علاوہ ہلکی پھلکی رائفلیں بھی کاندھے سے لٹکائے رہتے ہیں، بندوق سے بھی وہ ویسا ہی سچا نشانہ لگاتے ہیں جیسا کبھی نیزے سے لگاتے تھے، عام طور پر وہ زمیں پر لیٹ کر شکار پر پشت لیتے ہیں اور پھر گولی چلا دیتے ہیں۔

ان کا نشانہ اتنا سچا اور بے خطا ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر بے اختیار سائل دہلوی مرحوم کا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے ۔

نشانہ باز ایسے ہیں، قدر انداز ایسے ہیں  
ادھر چٹکی سے چھوڑا تیر، مٹھی سے کماں رکھ دی



## کتاب اور عرب

حیوان اور انسان کا رشتہ بہت قدیم ہے، ایک غیر معلوم مدت تک تو دونوں نے ایک سی ہی زندگی گزاری ہوگی، ایک دوسرے کے مقابل بھی رہے ہوں گے اور شریک کار بھی، مگر انسان کی تمدنی صلاحیت نے رفتہ رفتہ اسے حیوانی برادری سے دور کرتے کرتے بالکل خارج ہی کر دیا، یہاں پہنچ کر وحشت (جو حیوانی خصوصیات میں ہے) انسان کے لیے گالی کا مقام حاصل کر گئی، جنگلی کہلایا جانا کسی کو پسند نہیں آ سکتا۔

آدمیت کا مفہوم ہی یہ لیا جاتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو حیوانیت سے بالکل ہی پاک صاف بنالے، لیکن ابتدائی دور حیات میں جو حیوانوں کے ساتھ گزارا تھا وہ حیوانوں کی صلاحیتوں سے باخبر ہو گیا تھا، آدمی بن کر اس نے ان فوائد سے دست بردار ہونا ٹھیک نہ سمجھا جو حیوانوں سے اسے حاصل ہو سکتے ہیں اور اس نے یہ کمال دکھایا کہ خالص حیوانی برادری کو بھی اپنی پچکاروں سے اہلی اور وحشی میں تقسیم کر دیا، وہ جانور جو آدمی کے آس پاس گھومنے لگے پالتو کہلائے اور جنھوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا وہ جنگلی کے جنگلی ہی رہے۔

ان جانوروں میں جو آدمی کے ساتھ زندگی گزار لیتے ہیں کتاب بھی ہے اور یہ اتنے قدیم زمانہ سے انسان کے ساتھ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ تعین نہیں کیا جاسکتا کہ کتاب سے انسان کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے؟ القرآن نے متقدمین کی جو حکایتیں ہمیں سنائی ہیں ان میں ”اصحاب کہف“ کا ذکر بھی ہے اور ان کے ساتھ ان کے کتے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ان سے پہلے بھی کیا معلوم کتاب سے انسان کے ساتھ رہتا چلا آیا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب دور جاہلی میں تھا، پھر بھی عربی شعر و ادب نے عربوں کے متعلق

معلومات کو بڑی حد تک محفوظ کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ سے عرب میں کتے بھی آباد تھے البتہ ان کے مرتبہ سے متعلق مختلف اور متضاد باتیں سامنے آتی ہیں، تعریف و توصیف بھی ملتی ہے اور مذمت و ہجو بھی۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثریت کتوں کی طرفدار ہے، اس لیے ہم پہلے انھیں کا نقطہ نظر پیش کریں گے۔

جاہلیت میں یہ اعتقاد عام تھا ”نام“ انسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی لیے جب کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ اس کا نام رکھنے کے لیے اپنے قاعدہ کے مطابق فال لیتا، وہ گھر سے باہر نکلتا تا کہ پرندوں کو اڑائے، ان کے اڑنے کی سمت سے بھی سعد و نحس کا خیال عام تھا، ایسے میں اگر کسی کی زبانی ”حجر“ (پتھر) کا لفظ سننے میں آجائے یا کسی پتھر پر نگاہ پڑ جائے تو نو مولود کا نام ”حجر“ رکھ دیا جاتا اور یقین کیا جاتا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر شدت اور سختی کا مظاہرہ کرے گا اور اگر کہیں گدھا نظر آ جاتا تو پھر بچہ کا نام بھی ”عمار“ (گدھا) رکھا جاتا اور سمجھا جاتا کہ بڑی عمر پائے گا اور کتا سامنے آ جاتا تب تو بچے کا نام اسی کے نام پر ”کلب“ یا ”کلب“ (کتا یا کتے کا بچہ) رکھ دیا جاتا اور سمجھا جاتا کہ یہ کتے کی طرح ہوشیار، نگران کار، محافظ، بلند آواز اور نام آور ہوگا۔

کتوں کو پسند کرنے والے اسے ہوشیار جانور سمجھتے تھے اور اسی لیے اشراف عرب اپنے بچوں کا نام اسی کے نام پر رکھتے تھے تا کہ ان میں کتوں جیسی ہوشیاری آجائے۔ اس سلسلہ میں جو نام سب سے پہلے لیا جانا چاہیے وہ ”کلب ابن ربیعہ“ کا نام ہے جس کی عظمت ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے، کسی کو باعزت کہنا ہو تو ”اعز من کلب وائل“ (کلب سے زیادہ باوقار) کہتے تھے۔

”کلب“ عرب کی مشہور شخصیت ہے، جاہلیت میں کوئی اس کی ہمسری کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اسے اپنی بڑائی کا ایسا شدید احساس تھا کہ دوسروں کے لیے وہ وبال جان بن گیا تھا، جس چراگاہ یا جس چشمہ کو چاہتا اپنے لیے مخصوص کر لیتا، کسی کی مجال نہ تھی کہ اس طرف نگاہ کر سکے، کہا جاتا ہے اس نے ایک کتے کا پلا بھی پال رکھا تھا، جہاں جہاں وہ گھومتا یا جہاں تک اس پلے کی آواز سنی جاسکتی وہ سارا علاقہ ممنوعہ سمجھا جاتا اور کلب کی اجازت کے بغیر کوئی ادھر سے

گزر بھی نہ سکتا۔

یہ عزت و شرف جو کلیب وائل کو حاصل تھا اس کے متعلق جاہلیت کا ذہن یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے نام گلیب کی تاثیر نے اسے اتنا ہوشیار اور بہادر بنا دیا تھا کہ سب اس کی عزت کرنے پر مجبور تھے۔

”کلیب“ (کتے کا پلا) کے علاوہ عرب میں کلب (کتا) اور کلاب (بصیغہ جمع کتے) بھی نام رکھے جاتے تھے، بلکہ کلب کے ساتھ کنیت میں بھی کسی قسم کا عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ”بنو کلبہ“ (کتیا کے بیٹے) عرب کا مشہور خاندان گزرا ہے۔

جاہلیت میں کتوں کی خصوصیات سے متاثر ہو کر اپنے بچوں کا نام کلب وغیرہ رکھنا ہی باعث برکت نہیں سمجھتے تھے بلکہ عربوں میں کتوں کو خاص خاص ناموں سے پکارنے اور اپنے حسب نسب کی طرح کتوں کے حسب نسب کو محفوظ رکھنے کا بھی رواج تھا، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کتا کتنا مکرم جانور تھا مثلاً جذعان کے کتے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نام ”سہلب“ تھا اور اس کا نسب نامہ یہ ہے، سہلب بن البراق بن یحییٰ بن ذناب بن مظفر بن محارش۔ سہلب کے پانچ دادوں کے نام بھی اس سے معلوم ہوتے ہیں، کتوں کے یہ نام انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے۔

ایک شاعر مہمانوں کی خاطر اپنے رات تمام جاگتے رہ کر انتظام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کتے درو اس کو نہیں بھولتا، جو بھونک کر مہمانوں کو گویا راستہ بتاتا رہا اور رات تمام وہ بھی شاعر کے ساتھ سویا نہیں۔

بتناوبات جلید اللیل یضربنا بین البیوت قرانا نبیح درو اس  
شعرا کے کلام میں کتے کا تذکرہ اکثر اچھے الفاظ میں ملتا ہے۔ ایک شاعر اپنے ممدوح کی وفا شعاری کو اس طرح ادا کرنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتا کہ اسے کتے سے تشبیہ دے۔

انت کالکلب فی حفاظک للود و کاللیث فی قراع الخطوب  
(تو محبت کی پاسداری میں کتا ہے اور خطرات کے مقابلہ میں شیر۔)

عامر بن طفیل نے تو کمال کر دیا کہ اپنے ممدوح کو (جس وقت وہ ہتھیار سجائے لڑائی کے لیے



تیار ہے) کتے کی طرح سرخ آنکھوں والا بھی کہا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس سے ممدوح یا اس کی قوم برا نہیں مانے گی بلکہ اس تعریف پر سب خوش ہوں گے

ومد جح یسعی بشکتہ محمرة عیناہ کالکلب

(وہ ہتھیار لگائے چلتا ہے، اس کی آنکھیں کتے کی طرح لال لال ہیں)

عرب شعر اکتے کے بااخلاق ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس سے مالکوں کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کا اظہار مقصود ہوتا ہے:

فباک الین ابوابہم ورا دک آہلۃ عامرہ

(تیرے دروازہ پر حاضری سب سے زیادہ آسان ہے اور تیرا گھر بھرا پر ہے۔)

وکلکک آنس بالمعتفین من الام بابتہا الزائرہ

(اور تیرا کتا آنے والوں پر اس ماں سے زیادہ مہربان ہے جو اپنی لڑکی کی پذیرائی کرے۔)

ایک اور شاعر کتے کے مہمان کو خوش آمدید کہنے کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے

یکاد اذا ما ابصر الضیف مقبلا یکلمہ من حبه وهو اعجم

(جب وہ کسی مہمان کو آتا دیکھتا ہے تو گویا کہ وہ محبت سے اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

جاہلیت میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو کتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ہر اخلاقی خرابی کو کتے سے منسوب کرتے تھے، لیکن یہ لوگ کتوں کے جو عیب بیان کرتے تھے وہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً یہ کہنا کہ کتا مردار خور ہوتا ہے کوئی عیب نہیں، تمام برتر نسل کے درندے بھی مردار خوری کو برا نہیں سمجھتے۔ یا کتوں کے متعلق کہنا کہ وہ بدبودار جانور ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتا بدبودار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ کیسی ہی ورزش و دادوش کیوں نہ کرے اسے پسینہ نہیں آتا، تو اس کے بدبودار ہونے کا کیا سوال ہے۔

یہ الزام لگانا کہ کتا خراب جانور ہے، بچوں کو کاٹ کھاتا ہے یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے، پڑوسیوں کو تنگ کرتا ہے اور مہمانوں کو تکلیف دیتا ہے یا وہ بے دھڑک ہر جگہ پیشاب کر دیتا ہے یہ تمام باتیں تو ہر جانور سے متعلق کہی جاسکتی ہیں، ان میں کوئی خاص وزن ہرگز نہیں۔

کتوں کے مخالفین کے گروہ کو اسلام کے بعد تقویت حاصل ہوگئی کیونکہ قرآن نے آیات الہی

کو جھٹلانے والوں اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والوں کی تمثیل کتوں سے دی اور اس سے ان لوگوں کی تحقیر مقصود تھی۔

مثله كمثل الكلب ان تحمل عليه يلهث وان تتركه يلهث  
ذلك مثل القوم الذين كذبوا بآياتنا. (القران، ۱۲/۹)  
اس کی مثال کتے کی سی ہے اگر تو اس پر حملہ کرے وہ زبان نکال دیتا ہے اور  
اگر چھوڑ دیتا ہے یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے  
ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی یہ روایت تو بہت مشہور ہے کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں  
فرشتے نہیں آتے، ان الملائكة لا تدخل داراً فيه كلب.  
اور پھر جب نبی خاتم ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تو کتوں سے نفرت کرنے والوں کی  
تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

امرنا رسول الله ﷺ بقتل الكلاب حتى ان المرأة لتقدم  
بكلبيها من البادية فنقتله. ثم نهانا عن قتلها. قال عليكم  
بالاسود البهم ذى النكتتين على عينيه فانه شيطان.  
ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کے مارنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ  
کوئی عورت جنگل سے کتا ساتھ لاتی ہم اسے بھی مار ڈالتے، پھر ہمیں ان  
کے قتل کرنے سے منع کر دیا، فرمایا انھیں کو مارو جو گہرے کالے ہوں اور  
ان کی آنکھوں پر ٹیکے ہوں کہ وہ شیطان ہوتے ہیں۔

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کتوں کے مار ڈالنے کا حکم  
دیا ہم نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک مدینہ کے تمام کتے مار نہ ڈالے اور عورت کا کتا بھی۔

امرني رسول الله ﷺ ان اقتل الكلاب فكنا نقتلها فانقتلت  
الى ظاهر بنى العامر فاذا بعجوز مسكينة معها كلبها وليس  
بقربها انسان فقالت ارجع الى النبی فاخبره ان هذا الكلب

یونسنی ولیس قربی احد فرجع الیہ فاخبرہ فامر بقتل کلبہا  
فقتله وقال فی حدیث آخر انه لما فرغ من قتل کلاب  
المدينة وقتل کلب المرأة قال الان استرح.

مجھے رسول اللہ ﷺ نے کتے مارنے کا حکم دیا، ہم انھیں مار ڈالتے تھے۔  
میں بنو عامر کے علاقے سے باہر گیا وہاں ایک عورت کے پاس کتا تھا، اس  
کے پاس کوئی آدمی نہ تھا، اس نے کہانی کے پاس جاؤ، بتاؤ کہ یہ کتا ہی میرا  
مونس ہے، میرے پاس کوئی بھی نہیں انھیں مطلع کیا تو اس عورت کے کتے  
کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ ایک اور حدیث میں بیان کیا کہ جب مدینہ کے  
سارے کتے اور اس عورت کا کتا بھی مار ڈالا یا، تو کہا اب مجھے آرام ملا۔

اسلام میں کتے سے بھی گیا گزرا وہ شخص سمجھا گیا جو معصیت میں مبتلا ہوا اور خیانت کا مرتکب  
ہو۔ ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مقتول کو دیکھ کر اس  
کے بارے میں پوچھا، معلوم ہوا کہ اس شخص نے دوسرے کی بکری پکڑ لی تھی تو اس پر کتے نے حملہ  
کر دیا اور مار ڈالا۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا.....

قتل نفسه واضاع دينه وعصى ربه وخان اخاه وكان الكلب خيرا منه  
اپنی جان دی، دین کھویا، گناہ کیا اور بھائی سے خیانت کی، کتا اس سے بہتر تھا۔  
اسلام کے بعد عرب میں عام طور پر کتوں سے بیزاری پائی جانے لگی اور وہ تو قیر باقی نہ رہی  
جو جاہلیت میں تھی۔ اگرچہ فقہائے کرام کی رائیں کتے کے بارے میں مختلف اور متضاد پائی جاتی  
ہیں لیکن احتیاط اسی میں سمجھی گئی کہ کتوں سے دور رہا جائے اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔  
اسلامی دور کے شعرا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کتے کی تعریف کر جاتے ہیں مگر زیادہ تر کتا حقیر  
سمجھا جاتا ہے اور مقام ذم و ہج میں ہی اس کا ذکر ملتا ہے۔  
مشہور شاعر ابو الطیب منہب کا فور کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:

ما كنت احسبني ابقى الى زمن يسئ بي فيه كلب وهو محمود  
(مجھے خیال نہیں تھا کہ اس زمانہ تک زندہ رہوں گا کہ میرے ساتھ ایک کتا برائی سے

پیش آئے جس کی تعریف کی جاتی ہے۔)

ابوالعلاء المعری ابن الحصین کی ہجو میں کہتا ہے:

لا تغبط یا بن الحصین بصیبة اضحت لדיک کثیرة الا ولاد

لا فخر فیک ولا افتخاراً فیہم ولا ان الکلاب کثیرة الاعداد

(حصین کے لڑکے اس پر غرور مت کر کہ ایک چھوکری تیرے پاس بہت سے

بچوں والی ہو گئی ہے نہ تیرے لیے بڑائی ہے نہ ان سب کے لیے، کیونکہ کتے

ہوتے ہی بہت ہیں۔)

اس عام نفرت کے باوجود جو عہد اسلام میں کتوں سے متعلق پائی جاتی ہے کتے کی ضرب  
المثل وفاداری اپنی جگہ پر رہی۔ اشعار میں اس کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ حارث بن صعصعہ کے ان  
اشعار سے ظاہر ہے جو اس نے واقعہ کے بعد کہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح سے واپس  
آیا تو گھر پر اپنی بیوی اور اپنے ایک دوست کی لاشیں پڑی پائیں، یہ دوست کسی بہانے سے  
ساتھ نہیں گیا تھا، تنہائی اور دوست کے اعتماد کا غلط فائدہ اٹھاتا تھا، کتے نے انھیں ایسی حالت  
میں دیکھا تو دونوں کو ختم کر دیا۔

وما زال یرعی ذمتی و یحوطنی و یحفظ عرسی و الخلیل یخون

فیما عجباً للخلل یمتک حرمتی و یماء عجباً للکلب کیف یصون

(وہ کتنا برا برحق ادا کرتا اور میری دلہن کی حفاظت کرتا رہا اور دوست نے خیانت

کی، کتنا عجیب ہے کہ دوست تو عزت لوٹ لے اور کتنا اس کی حفاظت کرے۔)

غرض کے اسلام کے بعد کتے سے محبت کا دور ختم ہو گیا، شکاری کتے شکار یا چوکیداری کے لیے ضرور  
پالے جاتے رہے مگر عام کتے پرانی دوستی سے محروم ہو گئے، ان میں سے اکثر کو ویرانوں کی طرف  
لوٹ جانا پڑا، پھر بھی چونکہ کتنا انسان کے ساتھ رہ کر بہت سی آسائشوں کا عادی ہو گیا تھا اسی لیے  
بہت سوں سے شہر کی گلیاں چھوڑی نہ گئیں اور جہاں بھی انھیں ذرا سا آسرا ملا وہ کھڑکیوں، دروازوں  
اور دکانوں کے سامنے روٹی کے ٹکڑوں یا پھینکی ہوئی ہڈیوں کی آس میں اب بھی بیٹھے نظر آتے ہیں۔



## تلوار کی چھاؤں میں

عرب قوم کی زندگی سادہ اور ماحول رنگینیوں سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب رواں اور حقیقت سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے، ادب عربی کا مطالعہ ناظر کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ عربی ادب کی وہ خصوصیت جو تمام اصنافِ سخن میں پائی جاتی ہے، وہ ”آمد“ ہے۔ تکلف اور آورد کا نہ عرب قوم کی زندگی میں گزر رہے اور نہ وہ ان کے شعر و ادب میں عام طور سے برتی جاتی ہے۔ عرب شعرا میں ہمیں ایسے گنتی کے ہی شاعر ملتے ہیں جو شعر کا اہتمام کرتے تھے اور ان کا شعر ”حولیات“ میں شمار کیا جاتا تھا، عام طور پر عرب شعر اجذبات کی رو میں شعر کہا کرتے تھے۔

ابن رشیق نے ”آمد“ کی دو قسمیں کردی ہیں ”ارتجال“ اور ”بدیہہ“ ان دونوں میں بہت ہی کم فرق ہے، ارتجال بدیہہ کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے جس میں شاعر سوچنے کے لیے گردن بھی نہیں جھکاتا اور سننے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پہلے سے لکھا ہوا شعر سن رہا ہے۔

ارتجال کی بہترین مثالوں میں ابوالاسد کا وہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے جو اس نے ”الہادی“ کے سامنے قصیدہ پڑھتے ہوئے اس کے ٹوکنے پر پڑھ دیا اور سب یہی سمجھے کہ یہ شعر بھی قصیدہ میں پہلے سے تھا مگر جب قصیدہ دیکھا گیا تو وہ شعر کہیں نہیں تھا۔

ابوالاسد قصیدہ پڑھ رہا تھا جب اس نے یہ شعر پڑھا۔

یا خیر من عقدت کفاه حجرتہ      وخیر من قلدتہ امرہا مضر

تو موسیٰ الہادی نے درمیان میں کہا ”إلا من یا بئس“ شاعر نے اسی روانی میں شعر پڑھا۔

إلا النبى رسول اللہ ان له      فخرًا وانت بذلک الفخر یفتخر

ایسی روانی سے شعر کہنا اس وقت اور بھی لطف دے جاتا ہے جب سننے والا یہ سمجھ ہی نہ رہا ہو

کہ شاعر شعر کہہ رہا ہے، جب اس پر یہ بات واضح ہوتی ہے تو اس کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔  
ابو العتاهیہ کے یہ اشعار ارتجال کی بہترین مثال ہیں، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات گزار  
رہا تھا صبح قریب تھی اس نے مرغوں کی اذانیں سنیں تو کہا ۔

ابو العتاهیہ	هل رأيت الصباح لاحا
ساتھی-نعم (ہاں)	(کیا تو نے دیکھا صبح نکلی)
ابو العتاهیہ	وسمعت الديك صاحا
ساتھی-نعم (ہاں)	اور مرغ کی اذال سن
ابو العتاهیہ	انما يبكس على المغتر وناحا
	(بیشک وہ غافل پر رویا اور نوحہ کیا)

اب ساتھی چونکا اور اس نے اسے محفوظ کر لیا اور دوسروں کو سنایا۔  
بدیہہ گوئی کا اس سے کم مرتبہ ہے۔ اس میں شاعر تھوڑا سوچ کر شعر کہتا ہے اور اگر کتابت کا  
سامان موجود ہو تو جلدی جلدی لکھ لیتا ہے اور سناتا ہے مگر حقیقت میں یہ فرق برائے نام ہے،  
ارتجال اور بدیہہ دونوں شاعر کے کمال فن اور حاضر دماغی کی شہادتیں ہیں۔  
عرب شاعری تصنع سے دور رہی ہے اس لیے عرب شعرا میں عام طور پر روانی سے شعر کہنے کی  
صفت پائی جاتی ہے، جاہلیت میں عمرو ابن الہند کے سامنے حارث بن حلزہ نے قصیدہ کا قصیدہ فی  
البدیہہ پڑھا، اس قصیدہ کی یہی خوبی نہیں ہے کہ شاعر نے اسے اس طرح ارتجالا پڑھا تھا، وہ  
قصیدہ اپنے زور بیان اور خوبیوں کی بنا پر عربی ادب کے بہترین قصیدوں میں شمار کیا جاتا ہے اور  
اس کا شاعر بلا اختلاف سب سے بڑے سات شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔  
اسلامی شعرا میں روانی سے شعر کہنے والوں میں ابونواس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ الرشید کے  
دربار میں وہ جو شعری شاہکار پیش کرتا رہا ہے وہ تو اپنی جگہ ہیں ہی، ایک مرتبہ ابونواس خطیب کے  
ساتھ جامع مسجد گیا، خطیب نے تفریحاً اس سے کہا ابونواس یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ شعر میں تیرا  
جواب نہیں ہے مگر خطبہ دینا دوسری بات ہے۔

ابو نواس فوراً کھڑا ہو گیا اور اس نے بولنا شروع کر دیا

منحتکم یا اهل مصر نصیحتی      الا فخذوا من ناصح بنصیب  
رما کم امیر المؤمنین بحیہ      اکول لحيات البلاد شروب  
فان یک باقی سحر فرعون فیکم      فان عصی موسی بکف خصیب  
خصیب نے اس سے معذرت کی کہ میں نے مزاح میں کہا تھا اور اقرار کیا کہ بہترین مقرر بھی اس سے بہتر خطبہ نہیں دے سکتا۔

الرشید کا دربار ادیبوں اور شاعروں سے آراستہ رہتا تھا اور اکثر شعرا بدیہ گوئی کا جوہر دکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے شعرا کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مصرع کہا، جہاز نے فوراً مصرعے پہنچائے اور قطعہ مکمل ہو گیا:

الرشید      الملک لله وحده      ملک صرف خدا کے لیے ہے  
جہاز      وللخليفة بعده      اس کے بعد خلیفہ کے لیے  
وللمحب اذا ما      اور عاشق کے لیے جب

حبیبہ بات عندہ      اس کا محبوب اس کے پاس رات گزارے  
عربی ادب میں فی البدیہہ کہے جانے والے اشعار کی کمی نہیں ہے، مگر ان میں بھی ان اشعار کا مرتبہ سب سے بلند ہے جو شاعر نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے کہے، ایسے موقع پر دماغ کا حاضر رہنا اور شعر کہہ سکرنا واقعۃً تعجب انگیز ہے۔

تلوار کی چھاؤں میں طرفہ بن العبد البکری نے کس اطمینان سے یہ شعر کہے:

ابا مندر کانت غروراً صحیفتی      ولم اعطکم فی الطلوع مالی ولا عرضی  
ابا مندر افنیت فاستبق بعضنا      حنانیک بعض الشرا ہون من بعض  
عبد یغوث ابن ملاء نے مرتے مرتے جو قصیدہ کہا ہے اسے تلوار کی چھاؤں میں بہترین قصیدہ کہنا چاہیے، اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا، قاتل ڈرتے تھے کہ وہ مرتے مرتے ہجونہ کر دے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ گالی نہیں دے گا تو اس کا منہ کھولا گیا تا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے حال پر

رونا چاہے تو رو لے، مگر اس نے قصیدہ کہنا شروع کر دیا۔

اقول وقد شدوا لسانی بلسة  
امعشر تیمم اطلقو من لسانیا  
فیارا کبا اما عرضت فبلغن  
ندامای من نجران ان لا تلاقیا  
یہاں پر اس نے اپنے قاتلوں سے خواہش کی کہ وہ ایک ہزار اونٹ لے کر اسے چھوڑ دیں مگر  
انھوں نے نہ مانا اور قتل پر ہی مصر رہے تو اس نے کہا:

فان تقتلونی تقتلونی بخیر کم  
وان تطلقونی تحرونی بمالیا  
اس حالت میں ایسی روانی سے ایسے معیاری شعر کہنا شاعر کے کمال اور اس کی عجیب و غریب  
قلبی طاقت اور بہادری کا بین ثبوت ہے۔

حیرہ کے بادشاہ نعمان ابن منذر نے اپنے عتاب اور کرم کے دن مقرر کر رکھے تھے عتاب  
کے دن جو سامنے گیا سمجھو اس کی کمبختی آگئی، وہ اسے قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا، ایسے ہی ایک دن عرب  
کا مشہور اور صاحب کمال شاعر عبید بن الابرص نعمان کے پاس پہنچ گیا، نعمان نے اس سے کہا  
مرنے سے پہلے مجھے اپنا وہ شعر تو سنا دو

اقضر من اهلہ ملحوب  
فالقطیات فالذنوب  
عبید نے کس اطمینان اور سکون سے کہا وہ نہیں یہ سنو:

اقضر من اهلہ عبید  
فالیوم لا یبدی ولا یعید  
اسلامی دور کے شعرا میں علی ابن الجہم بڑا شاعر گزرا ہے۔ عباسی بادشاہ المتوکل کے دربار میں  
اس کا بڑا مقام تھا، جس وقت اسحاق ابن اسمعیل کا سر المتوکل کے سامنے پیش کیا گیا تو ابن الجہم  
نے فی البدیہہ مبارکباد پیش کر کے داد و تحسین حاصل کی۔

اهلا وسهلا بک من رسول  
جئت بما یشفی من الغلیل

برأس اسحاق ابن اسمعیل

اور پھر دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ قادر الکلام اپنے فن کا مظاہرہ اس وقت بھی کر سکتا  
ہے جب کہ اسے برہنہ کر کے سولی پر لٹکایا جا چکا ہے، اس وقت علی ابن الجہم کے یہ شعر کتنے  
لاجواب ہیں:



لم ينصبوا بالشازياخ عشية او  
 نصبوا بحمد الله ملء عيونهم  
 اثنين مغلول ولا مجهولا  
 حسنا وملء قلوبهم تبجيلا  
 ماضره ان بز عنه لباسه  
 فالسيف اهول ما يرى مسلولا  
 تمیم ابن جمیل کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے جنہوں نے تلوار کی چھاؤں میں  
 ہوش و حواس نہیں کھوئے اور اس وقت بھی اس نے کمال فن کا اظہار کیا جب موت میں اور اس میں  
 ذرا سے اشارے کی دُوری تھی۔

المعتصم کے دربار میں چمڑے کا وہ فرش بچھایا جا چکا تھا جسے ”نطح“ کہتے ہیں جس پر بادشاہ  
 کے سامنے دربار میں خاص خاص لوگوں کو قتل کیا جاتا تھا، جلاد نے تلوار سونت لی تھی مگر ابن جمیل بغیر  
 کسی پریشانی کے یہ اشعار کہتا چلا جا رہا تھا:

اری الموت بین النطح والسيف كامنا  
 واكبر ظنى انك اليوم قاتلى  
 واى امرئ يدلى بعذر و حجة  
 يغر على الاوس بن تغلب موقف  
 وما حزننى انى اموت واننى  
 ولكن خلفى صبية قد تركتهم  
 كانى اراهم حين انعى انهم  
 فان عشت عاشوا خافضين بنعمة  
 فكم قائل لا ابعد الله داره  
 يلا حظنى من حيث ما اتلفت  
 واى امرئ مما قضى الله يفلت  
 وسيف المنى يا بين عينيه مصلت  
 يسل على السيف منه واسكت  
 لا علم ان الموت شئى موقت  
 واكبادهم من خسارة تتنقت  
 وقد خمشوا تلك الوجوه وصوتوا  
 اذود الردى عنهم وان مت موتوا  
 و آخر جذلان يسر ويشمت

تلوار کی چھاؤں میں ابن جمیل کے ان اشعار کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہو گئی ہے کہ انھیں  
 سن کر المعتصم نے نہ صرف ابن جمیل کے قتل کا حکم واپس لے لیا بلکہ اسے زندگی گزارنے کے لیے  
 کام بھی دلایا۔

☆☆☆

## دھوپ چھاؤں ☆

اس دنیا نے عروج و زوال کے سینکڑوں واقعات دیکھے ہیں، بہار و خزاں، دن رات اس کی فطرت ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اس کے بسنے والوں نے ان کو یاد رکھا ہو جن کا وقت گزر گیا، ہماری زبان اردو میں تو مثل ہی ہے ”اترا ستنہ مردک نام“، گویا یہ ایک طرح انسانی کمزوری ہے کہ وہ اپنے فائدوں سے قطع نظر کر ہی نہیں سکتا اور اسی لیے اس سے آنکھیں چرا لیتا ہے جس سے کوئی کام بننے کی توقع نہ ہو۔

تغیرات تو کائنات کی فطرت ہیں لیکن ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقلی عام طور پر بتدریج ہوتی ہے اس لیے نگاہیں اچنبھا محسوس نہیں کرتیں بلکہ بعض اوقات تو ارباب بصیرت اسباب و علل کا ادراک رکھنے کے باعث انقلاب کی پیشگوئی ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے منتظر بھی رہتے ہیں، کم ہی ایسے حادثات ہوں گے جو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے ہوں، تاریخ اسلام میں ”البرامکہ“ کی داستان عروج و زوال انھیں استثنائی صورتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

برامکہ کے عروج کا ستارہ عباسی بادشاہ ہارون الرشید کے عہد میں طلوع ہوتا ہے اپنی فیض بار کرنوں سے ضیاء باری کرتا ہے اور اسی عہد میں غروب بھی ہو جاتا ہے، اتنے مختصر عرصہ میں یہ تمام منزلیں طے ہوتی ہیں کہ مشاہدہ کرنے والی نگاہیں متحیر رہ جاتی ہیں۔

برامکہ کو تاریخ میں خاص مقام دلانے والی ہستیاں تین ہیں، ایک باپ یحییٰ اور دو بیٹے فضل اور جعفر۔ یہ خاندان پہلے مجوسی تھا، پھر مسلمان ہو گیا، اپنے علم و فضل اور سوچ بوجھ کے باعث یحییٰ ابن خالد برمک ہارون الرشید کی شہزادگی کے زمانہ میں ہی اس سے متعلق ہو گیا تھا اور ہارون الرشید

☆ یہ مضمون مصنف کی ہمشیرہ فرزانه قادریہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔

نے تخت نشین ہونے پر یحییٰ کو اپنا وزیر اعظم بنا دیا کیونکہ ہارون رشید کی تخت نشینی حقیقت میں یحییٰ کی تدبیر سے ہی ہوئی تھی۔

مہدی نے اپنے بعد اپنے دونوں بیٹوں کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کیا تھا۔ موسیٰ الہادی تخت نشین ہوا تو اسے خیال ہوا کہ اس کے بعد ہارون الرشید کی بجائے اس کا بیٹا جعفر ابن الہادی بادشاہ ہو، موسیٰ الہادی نے یحییٰ کو بیس ہزار اشرفیاں دیں اور تحلیہ میں مشورہ کیا، یحییٰ کی دلی تمنا ہارون الرشید کو بادشاہ دیکھنے کی تھی، اس طرح اسے مراتب ملنے کی امید تھی لیکن اس نے موسیٰ الہادی سے گفتگو اس انداز سے کی کہ وہ مطمئن ہو گیا۔

تاریخ الفخری نے وہ الفاظ نقل کیے ہیں جن سے یحییٰ کی ذہانت اور حسن تدبیر کا پتہ چلتا ہے:

یا امیر المؤمنین ان فعلت حملت الناس علی نکت الایمان ونقض العهد ولو ترکت اخاک ہارون علی ولایة العهد ثم بایعت لجعفر بعده کان ذلک او کد فی بیعتہ.

اے امیر المؤمنین! اگر آپ یہ فرمائیں گے تو لوگوں کو قسمیں توڑنے اور عہد فراموشی کی جرأت ہوگی اور اگر اپنے بھائی ہارون کو ولی عہدی پر باقی رکھتے ہوئے اس کے بعد جعفر کے لیے بیعت لیں گے تو یہ اس کی بادشاہت کو یقینی بنادے گا۔  
تھوڑے دن بعد پھر بیٹے کی محبت نے زور مارا اور موسیٰ الہادی نے دوبارہ یحییٰ کو بلا کر پھر مشورہ کیا تو یحییٰ نے کہا.....

یا امیر المؤمنین لو حدث بک حادث الموت وقد خلعت اخاک وبایعت لابنک جعفر وهو صغیر دون البلوغ. افتری کانت خلافتہ تصح وکان مشائخ بنی ہاشم یرضون ذلک ویسلمون الخلافة الیہ.  
اے امیر المؤمنین! اگر آپ کو موت کا حادثہ پیش آجائے اور آپ اپنے بھائی کو ولی عہدی سے معزول کر چکے ہوں اور اپنے بیٹے جعفر کے لیے جو ابھی نابالغ بچہ ہے بیعت لی ہو تو کیا خلافت صحیح ہوگی اور بنو ہاشم کے بڑے بوڑھے اس پر راضی ہو جائیں گے اور اسے بادشاہت دے دیں گے۔

قال (موسیٰ الہادی) لا

موسیٰ الہادی نے جواب دیا نہیں۔

قال یحییٰ- فذع هذا الامر تاتيه عفواً ولولم يكن المهدي بايع

لہارون لوجب ان تبایع انت له لئلا تخرج الخلافة من بنی ابیک۔

یحییٰ نے کہا تو اس معاملہ کو چھوڑ دیجیے، خود بخود اسے موقع ملے گا۔ اگر مہدی نے

ہارون کے لیے ولی عہدی کی بیعت نہ لی ہوتی تو اس وقت آپ پر لازم تھا کہ آپ

اس کے لیے بیعت لیں تاکہ خلافت آپ کے باپ کے گھر میں تو رہے۔

موسیٰ کو جعفر کی ولی عہدی کے ارادہ سے باز رکھنا ہارون الرشید کی سب سے بڑی خدمت تھی چنانچہ

جب ۷۰ھ میں ہارون الرشید تخت نشین ہوا تو فوراً یحییٰ ابن خالد بن برمک کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا

اور یہیں سے برا مکہ کے عروج و اقبال کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔

علامہ طقطقی نے یحییٰ کے متعلق لکھا ہے:

كان كاتباً بليغاً ادبياً شديداً اصائب الاراء حسن التدبير ضابطاً لما

تحت يده قوياً على الامور جواداً يبارى الريح كرمًا وجوداً ممدوحاً

لكل لسان حلماً عفيفاً وفوراً مهيباً۔

وہ عمدہ کاتب، بہترین ادیب، صائب الرائے مدبر، منتظم، دشواریوں پر قابو پانے

والا، بے حد سخی، سب کا مددگار، بردبار، پاکباز، باوقار اور بارعب تھا۔

اس سے نہ صرف اس کی علمی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اچھے خصائل اور اعلیٰ عملی

صلاحیتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے جوہ و عطا کی تعریف میں ایک شاعر نے کتنے لطیف

شعر کہے ہیں۔

لا ترانی مصافحاً كف يحيى انسى ان فعلت ضيعة مالى

لويمس البخيل راحة يحيى لسنحت نفسه ببذل نوالى

تم مجھے یحییٰ سے مصافحہ کرتے نہیں دیکھو گے، اگر میں ایسا کروں تو اپنی دولت برباد

کروں گا۔ اگر کسی کنجوس کا ہاتھ یحییٰ کے ہاتھ سے چھو جائے، تو اس کا دل بخشش

فراواں پر آمادہ ہو جائے۔

یجی کی وزارت نے ہارون الرشید کے دور کو ہر اعتبار سے بنو عباس کی حکومت کا بہترین دور بنادیا تھا۔ اس کی خدمات کا خلاصہ ابن طباطبا کی زبانی سنئے:

فنض یحیٰ بن خالد باعباء الدولة اتم نهوض . سدالشغور وتدارک  
الخلل وجبی الاموال وعمر الاطراف و اظهر رونق الخلافة وتعدی  
لمهمات المملكة.

یجی نے حکومت کو بے اندازہ ترقی دی، چوکیاں مضبوط کیں، فتنے فرو کیے، محصول وصول کیے، بستیاں بسائیں اور خلافت کی رونق میں اضافہ کیا اور بادشاہت کا بہترین انتظام کیا۔

فضل ابن یجی کو ذاتی فضائل کے علاوہ ہارون الرشید سے یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ اس کا دودھ شریک بھائی بھی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ابن ابی حفصہ نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

کفی لک فخراً أن اکرم حرة غذتک بشدی والخليفة واحد  
تیرے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ سب سے بزرگ عورت نے تجھے اور خلیفہ کو ایک چھاتی سے دودھ پلایا ہے۔

فضل بھی اپنے جود و نوال میں اپنے باپ یجی کا خلف صدق تھا، اسحاق ابن ابراہیم الموصلی نے ایک کنیز کو تربیت دی تھی اسے فضل کی خدمت میں پیش کیا، فضل نے کہا مصر کے حاکم کا سفیر مجھے تحفہ دینا چاہتا ہے، میں اس کنیز کی طرف اشارہ کر دوں گا، جب وہ تمہارے پاس آئے تو پچاس ہزار اشرفی سے کم نہ لینا۔

سفیر مصر موصلی کے پاس آیا، کنیز کی قیمت دس ہزار دینار لگائی، موصلی نے انکار کیا، اس نے بیس ہزار کہے، اس نے پھر انکار کیا، اس نے تیس ہزار کی بولی لگائی، موصلی میں اب ضبط کی طاقت نہ رہی اور کنیز کو فروخت کر دیا، دوسرے دن فضل نے پوچھا کنیز کتنے میں فروخت کی، موصلی نے بتایا تیس ہزار میں، فضل نے کہا میں نے کہا تھا پچاس ہزار سے کم قبول نہ کرنا، موصلی نے کہا اس کے

تیس ہزار کہنے پر میں طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا، فضل مسکرایا اور کنیز واپس کرتے ہوئے کہا روم کے حاکم کا سفیر آئے تو اس سے پچاس ہزار سے کم نہ لینا۔

رومی سفیر نے اسحاق سے قیمت پوچھی، اس نے پچاس ہزار دینار بتائے، اس نے کہا یہ تو زیادہ ہیں تیس ہزار لے لو، اسحاق فوراً راضی ہو گیا، قیمت لے کر کنیز دے دی، دوسرے دن فضل نے پوچھا اور اس نے بتایا تیس ہزار دینار، فضل نے کہا میں نے تمہیں سمجھا دیا تھا، اسحاق نے کہا تیس ہزار سنتے ہی میرے ہوش بجا نہ رہے، فضل نے کنیز واپس کر دی اور کہا خراسان کے حاکم کا سفیر بھی تمہارے پاس آئے گا، پچاس ہزار دینار سے کم نہ لینا۔

خراسانی نے قیمت پوچھی اسحاق موصلی نے پچاس ہزار دینار بتائی، خراسانی نے کہا بہت زیادہ ہیں تیس ہزار لے لو، اسحاق نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا اور انکار کیا خراسانی نے چالیس ہزار لگائے، اسحاق سے ضبط نہ ہو سکا اور فوراً کنیز دے کر قیمت لے لی، پھر فضل نے پوچھا کہ اب کتنی قیمت وصول ہوئی اس نے بتایا چالیس ہزار، بس چالیس ہزار سنتے ہی میرے ہوش و ہواس نے جواب دے دیا، اسحاق نے کہا میں تجھ پر قربان ہو جاؤں ایک کنیز کے ایک لاکھ دینار وصول ہو چکے ہیں، اب اس سے زیادہ کی تمنا نہیں، یہ سن کر فضل نے کنیز کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ کنیز پھر اسحاق موصلی کو ہی بخش دی اور اسحاق نے فوراً اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی۔

جعفر بھی اپنے باپ اور بھائی فضل کی طرح ہی سخی اور مدبر تھا، صرف ایک واقعہ اس کی کافی شہادت فراہم کر سکتا ہے۔ جعفر اور حاکم مصر کے تعلقات ناخوشگوار تھے، ایک شخص نے جعفر کی طرف سے حاکم مصر کے نام جعلی خط بنایا کہ ”حامل ہذا میرے مخصوصوں میں ہیں، مصر کی سیر کرنا چاہتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ خاص توجہ کریں“۔ یہ رقعہ لے کر وہ شخص مصر پہنچا۔

حاکم مصر کو اس رقعہ پر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی، اس شخص کو تو عزت سے مہمان بنایا مگر شک رفع کرنے کے لیے وہ خط بغداد میں اپنے نمائندہ کو بھیجا کہ تحقیق کر کے اطلاع دے، وہ اس خط کو لے کر جعفر کے سکریٹری کے پاس آیا، واقعہ سنایا اور شناخت کے لیے پیش کیا، سکریٹری نے وہ خط جعفر کو دکھایا اور تفصیل بتائی، جعفر نے خط دیکھتے ہی پہچان لیا کہ جعلی ہے، پھر اپنے مصاحبوں کو خط دکھا کر اور واقعہ بتا کر ان کی رائے معلوم کی، سب نے خط کے جعلی ہونے کی تصدیق کی اور رائے

دی کہ اس شخص کو سخت سزا دینی چاہیے تاکہ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرے۔  
 جعفر نے مصاحبوں کی رائیں سن کر کہا، سبحان اللہ! کیا تم میں کوئی ایک بھی سمجھ دار نہیں ہے،  
 تمہیں معلوم ہے کہ میرے اور حاکم مصر کے تعلقات خراب ہیں اور کوئی بھی جھکنا نہیں چاہتا تو اللہ  
 کی طرف سے ہی ہے کہ اس نے ایک ایسا شخص پیدا کر دیا جس نے صلح کا دروازہ کھول دیا، اسے  
 سزا نہیں انعام ملنا چاہیے۔ پھر جعفر نے قلم لے کر حاکم مصر کو لکھا ”آپ کو میرے خط میں شک آخر  
 کیوں ہوا، یہ شخص میرا عزیز مصاحب ہے، اس کی خاطر مدارات کیجیے اور جلد میرے پاس بھیجے  
 میں اس کا مشتاق اور محتاج ہوں۔“

حاکم مصر جعفر کا یہ خط دیکھ کر بہت مسرور ہوا، اس شخص کو تحفے دے کر واپس کیا، جب وہ بغداد  
 پہنچا تو وہ اچھے خاصے مالدار لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا، وہ شخص جعفر کے پاس حاضر ہوا، زمین  
 بوس ہو کر رونے لگا، جعفر نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا تم آخر ہو کون؟ اس نے جواب دیا  
 میں وہی مجلساز ہوں جو آپ کے احسان سے دبا ہوا ہے، جعفر سمجھ گیا اور پوچھا حاکم مصر نے کتنا  
 دیا، اس نے بتایا ایک لاکھ دینار، جعفر نے کہا اب تم ہماری مہمانی قبول کرو تا کہ رقم دگنی ہو جائے  
 اور خود بھی ایک لاکھ دینار دیے۔

براکہ کے زوال کے اسباب بظاہر محسوس نہیں ہوتے تھے کیونکہ جعفر کے قتل اور براکہ کے  
 استیصال تک ہارون الرشید کی مہربانیاں برابر قائم تھیں، یہ ضرور ہے کہ براکہ کی شوکت ان کے  
 حاسدوں کو ابھار رہی تھی اور وہ ہارون الرشید کے کان بھرنے میں کمی نہیں کر رہے تھے مگر عام طور پر  
 کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کا ایسا دردناک انجام ہونے والا ہے۔

ہارون الرشید حج سے واپسی پر حیرہ سے کشتیوں کے ذریعہ انبار چلا گیا اور جعفر سیر و شکار کے  
 لیے نکل گیا، بادشاہ کی طرف سے جعفر کو تحفے برابر پہنچ رہے تھے اور وہ جنگل میں منگل منار ہا تھا،  
 اس کے ندیموں میں تختیسوع طبیب اور ابوزکار مغنی حاضر تھے، دور چل رہا تھا اور ابوزکار گار ہا تھا،  
 ادھر ہارون الرشید نے اپنے خادم مسرور کو حکم دیا کہ فوراً جعفر برکی کا سر پیش کرے اور اس سلسلے  
 میں دوبارہ ہرگز نہ پوچھے، مسرور فوراً جعفر کی عشرت گاہ کی طرف متوجہ ہوا اور بغیر اجازت لیے  
 ہوئے اندر گھستا چلا گیا، جس وقت مسرور اندر پہنچا ہے تو ابوزکار گار ہا تھا:

فلا تبعد فكل فتى سبأتى عليه الموت يطرق اويغادى  
اے محبوب چھوڑ کر نہ جا کیونکہ ہر شخص کے پاس موت آتی ہے خواہ رات میں آ کر  
دروازہ کھٹکھٹائے یا صبح ہوتے آ جائے۔

جعفر نے مسرور کو اس طرح داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو کہا، امیر المومنین کے خاص خادم کے  
آنے سے خوشی ہوئی، مگر اس طرح بے اجازت اندر آنا بھلا نہیں لگا، مسرور نے کہا میں جس غرض  
سے آیا ہوں وہ اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے، امیر المومنین جو چاہتے ہیں اس کی تعمیل کرو۔  
جعفر سمجھ گیا اور مسرور کے قدموں میں گر کر کہا ایک دفعہ پھر امیر المومنین سے پوچھ لو انھوں نے  
شراب کی ترنگ میں کچھ کہہ دیا ہوگا، مسرور نے جواب نہیں دیا، جعفر نے خواہش کی کہ اسے گھر میں  
جا کر سب سے ملنے اور وصیت کرنے کی اجازت دی جائے، مسرور نے گھر میں جانے کی اجازت  
نہیں دی، کہا جو وصیت کرنا ہے یہیں کر لو اور اسے گرفتار کر کے رشید کے محل میں لا کر قتل کر دیا۔  
مسرور نے جعفر کا سر طشت میں اور دھڑ ایک چمڑے کے فرش (نطح) میں رکھ کر ہارون  
الرشید کی خدمت میں پیش کیا، ہارون الرشید نے اسی وقت یحییٰ ابن خالد برکی، فضل ابن یحییٰ اور  
براکہ کے تمام لوگوں کے گرفتار کرنے کا حکم دیا اور ان کا نام و نشان مٹا دیا، عام فرمان نافذ ہوا کہ  
کوئی شخص برا مکہ کا نام تک نہ لے اور نہ ان کے اوپر غم کا اظہار کرے، ورنہ وہ بھی سزا کا مستحق ہوگا۔  
مورخ عمرانی نے بیان کیا ہے کہ اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں، میں ایک دفعہ شاہی دفتر  
میں گیا تو ایک یادداشت میں نگاہ سے گزرا ”وزیر جعفر ابن یحییٰ کو خلعت شاہی کی قیمت چار لاکھ  
دینار“، پھر کچھ دن بعد جانے کا اتفاق ہوا تو اسی کے نیچے لکھا پایا، جعفر ابن یحییٰ کی لاش جلانے کے  
لیے تیل اور بوریہ کی قیمت چار قیراط“۔

☆☆☆



## خطیب اور خطبہ ☆

قوت گویائی انسان کو اسی لیے ودیعت کی گئی ہے کہ اس سے کام لے کر وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور تمدن و حضارت پروان چڑھے جو حقیقت میں انسانیت کا امتیاز ہے، اس لیے زبان تو گویا انسان کی فطرت ہی ہے اور ادب زندگی کا ساتھی لیکن ادب کی قسموں میں اولیت نثر کو حاصل ہے، کیونکہ وہ آسانی سے بولی جاتی ہے اور بغیر فکر اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔

ادب عربی میں بھی نظم کے مقابلہ میں نثر ہی اولیت کا مقام رکھتی ہے لیکن چونکہ عرب قوم بے اندازہ زمانہ تک کتابت سے بے نیاز تھی اسی لیے عربوں کے قدیمی نثری کارنامے پوری طور پر محفوظ نہیں رہ سکے۔

علمائے ادب نے نثر عربی کی تقسیم یوں کی ہے، امثال، حکم، وصایا، خطب اور وصف، ان میں سے پہلی دو قسمیں اپنے اختصار کے باعث زیادہ زبان زد ہوئیں اور ان کا بڑا سرمایہ بعد میں محفوظ کر لیا گیا، وصایا، خطب اور وصف چونکہ ایک حد تک طوالت چاہتے ہیں، اس لیے وہ مکمل طور پر محفوظ نہ رہ سکے۔

وصایا، خطب اور وصف کا بیشتر حصہ ہمیں نہ مل سکا، مگر وصیتوں، خطبوں اور وصف میں سے خاص خاص حصے جو ان کے بہترین حصے سمجھے جانے چاہئیں، زبان زد ہوئے اور محفوظ کر لیے گئے جو قدیم نثر عربی کے نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اگرچہ خطبوں کے قدیم ذخیرہ پر ہمیں دسترس حاصل نہ ہو سکی مگر خطیبوں کے اسلوب بیان اور انداز خطابت وغیرہ کے متعلق اکثر باتیں محفوظ رہیں اور بہترین خطیبوں کے نام بھی بھلائے نہ جا

☆ یہ مضمون مصنف کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری (مرحوم) کے نام سے شائع ہوا تھا۔

سکے۔ چنانچہ ادب عربی کا طالب علم نہایت اطمینان سے بتا سکتا ہے کہ جاہلیت کے خطیبوں میں سب سے بلند مرتبہ پر یہ لوگ فائز تھے۔ قیس بن ساعدہ الایادی، عمرو ابن کلثوم التغلبی، اکثم ابن صیفی التمیمی، حارث ابن عباد البکری، قیس ابن زہیر العبسی اور عمرو ابن معد یکرب الزبیدی۔

خطبہ اور وصیت کو ایک ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ ان میں نمایاں فرق یہی ہے کہ خطبہ مجمع عام میں دیا جاتا ہے اور وصیت خاص لوگوں میں کی جاتی ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے دونوں کو ایک سا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ مقصد سمجھانا اور اپنی بات منوانا ہی ہوتا ہے۔

خطیب بھی عرب قبائل کے لیے اتنی ہی اہمیت کا حامل تھا جتنا شاعر تھا بلکہ ایک اعتبار سے خطیب کا مقام کچھ زیادہ ہی بلند تھا کیونکہ اگر کسی وقت نمائندگی کا سوال ہوتا تو ایسے مواقع پر قبیلہ خطیب کو ہی چنتا اور یہ ذمہ داری اسی کے سپرد کی جاتی۔

خطیب عام طور پر کسی بلند جگہ کھڑے ہو کر یا اپنی سواری (اونٹ یا گھوڑے) پر سوار ہو کر خطبہ دیتا، اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے نہ صرف آواز میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتا بلکہ اشاروں سے بھی کام لیتا اور اکثر ہاتھ میں لکڑی، نیزہ، کمان یا تلوار رکھتا، ان کا سہارا لیتا اور جوش میں انھیں ہلا ہلا کے ایسے اشارے کرتا کہ سننے والے زیادہ سے زیادہ متاثر ہوں۔

الفاظ عمدہ، عبارت رواں اور خیالات واضح ہوتے، سجع یا قافیہ بندی بہت کم ہوتی اور امثال زیادہ دہرائی جاتیں، کیونکہ وہ پہلے سے سب کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہوتیں، اس طرح اس کی بات میں تاثیر زیادہ ہو جاتی۔

طلوع اسلام کے ساتھ شعر کے مقابلہ میں خطابت کو زیادہ ترقی ہوئی، کیونکہ اسلام کا پیام سب تک پہنچانے کے لیے خطابت سے ہی کام لیا جانا زیادہ مناسب تھا، اسی بنا پر اسلامی خطبا اپنے پیشرو جاہلی خطبا پر بھی سبقت لے گئے۔

جاہلی خطابت اور اسلامی خطابت میں خاص فرق یہ پیدا ہوا کہ اسلامی خطابت میں امثال و حکم کی جگہ قرآنی اشاروں نے لے لی اور اس کی وجہ سے خطبہ کی تاثیر بڑھ گئی۔

دور اسلامی کے خطیبوں میں سب سے اہم شخصیت تو خود صاحب رسالت ﷺ کی ذات ہی

ہے، ان کے خطبات اپنے اندر موعظت اور ادب کے ایسے خزانے رکھتے ہیں جن کا جواب ہی پیش نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً وہ خطبہ جو سرور کائنات ﷺ نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا عربی خطبوں میں شاہ خطبہ کا درجہ رکھتا ہے۔

ذات فخر کونین ﷺ کے بعد حضرات ائمہ راشدین کا مقام آتا ہے، وہ اپنے وقت کے بہترین خطیب تھے اور ان کے خطبات خطابت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

جب سقیفہ بنی ساعدہ میں امت نے حضرت امام صدیق اکبر کا انتخاب کر لیا اور ان کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت کی جا چکی تو انھوں نے بہ حیثیت خلیفۃ الرسول پہلا خطبہ دیا، یہ خطبہ امت کے اعتماد کا شکر یہ بھی ہے اور اس اعتماد کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنے عزائم کا اعلان بھی۔

خطب ابو بکر لما بویع بالخلافة. حمد الله واثني عليه ثم قال:  
ايها الناس اني قد وليت عليكم ولست بخيركم فان رايتموني  
على حق فاعينوني وان رايتموني على باطل فسدووني. اطيعوني  
ما اطعت الله فيكم. فاذا عصيته فلا طاعة لي عليكم الا ان اقواكم  
عندى الضعيف حتى آخذ الحق له. واضعفكم عندى القوي حتى  
آخذ الحق منه. اقول قولی هذا واستغفر الله لي ولكم.

صدیق اکبر نے خطبہ دیا جب خلافت کی بیعت کی گئی، اللہ کی حمد و ثنا کی پھر کہا:  
اے لوگو میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں حالانکہ تم میں سب سے بہتر نہیں، اگر تم مجھے  
حق پر دیکھو تو میری مدد کرنا، اگر مجھے غلطی پر دیکھنا تو مجھے روک دینا، میری  
اطاعت کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں اگر میں اس کی نافرمانی کروں  
تو تم پر میری اطاعت لازمی نہیں۔ دیکھو! سب سے کمزور میرے خیال میں  
سب سے طاقتور ہے کہ میں اس کا حق دلاؤں۔ سب سے طاقتور میرے  
نزدیک سب سے کمزور ہے کہ میں اس سے حق چھین لوں۔ میں یہ بات کہہ رہا  
ہوں اور اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے مغفرت چاہوں

اور پھر تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس مرد بزرگ کے الفاظ جس جواں مردی کا اظہار کر رہے تھے

کیسی ناقابل انکار حیثیت تھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خطبہ کے آخر میں مخصوص الفاظ کہتے تھے جن سے سننے والے سمجھ لیتے تھے کہ اب خطبہ ختم ہو رہا ہے۔

اللہم اجعل خیر زمانی آخرہ وخیر عملی خواتمہ وخیر ایامی  
یوم القاک۔

اے میرے اللہ میری زندگی کا آخری حصہ بہتر بنا دے اور میرے کاموں کا  
انجام اچھا ہو اور میرا بہترین دن جب میں تجھ سے ملوں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کا سد بات کرنے کے لیے ارباب شوری سے تبادلہ خیال کے بعد وصال فرمانے سے پہلے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد امام نامزد فرمایا، اور جب یہ امر عظیم ان کے کاندھوں پر آگیا تو انھوں نے بھی سنت صدیقی کی متابعت میں خطبہ دیا۔ امام فاروق اعظم کا امت سے یہ پہلا خطاب بہت سی خوبیوں کا حامل ہے، سب سے خاص بات تو یہ ہے کہ اس میں اپنے لائحہ عمل کی وضاحت کی گئی ہے اور امت سے اطاعت کا عہد لیا گیا ہے مگر کہیں پر بھی یہ نہیں کہا میں یہ کروں گا اور تمہیں اطاعت کرنی پڑے گی۔ اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا میں دعا کرتا ہوں سب آمین کہیں۔ یعنی جو وہ اپنے رب سے مانگیں، سب اس طلب میں شریک ہو جائیں اور پھر دعا میں وہ سب کہہ دیا جو انھیں کرنا تھا۔

خطب عمر اذ ولی الخلافة. حمد الله واثنى عليه. ثم قال:  
ايها الناس! انى داع فامنو. اللهم انى غليظ القلب فلينى لاهل  
طاعتك بموافقة ابتغاء وجهك والدار الاخرة. وارزقنى  
الغلظة والشدة على اعدائك واهل الدراعة والنفاق من غير  
ظلم منى لهم ولا اعتداء عليهم اللهم انى شحيح فسخرنى فى  
نوائب المعروف قصداً من غير سرف ولا تبذير ولا رياء ولا  
سمعة واجعلنى ابتغى بذلك وجهك والدار الاخرة. اللهم  
ارزقنى خفض الجناح ولين الجانب للمؤمنين. اللهم انى كثير  
الغفلة والنسيان فالهمنى ذكرك على كل حال و ذكر الموت

فی کل حین. اللہم انی ضعیف عند العمل بطاعتک فارزقنی  
 انشاط فیہا والقوة علیہا بالنية الحسنة التي لا تكون الا بغرتک  
 وتوفیقک . اللہم ثبتنی بالیقین والبر والتقوی و ذکر المقام بین  
 یدک والحياء منک وارزقنی الخشوع فیما یرضیک عنی  
 والمحاسبة لنفسی واصلاح الساعات والحذر من الشبهات .  
 اللہم ارزقنی التفکر والتدبر لما یتلوه لسانی من کتابک والفہم  
 له والمعرفة بمعانیہ والنظر فی عجائبہ والعمل بذلک مابقی  
 انک علی کل شیء قدير .

عمر نے خطبہ دیا جب خلافت انھیں سونپی گئی، اللہ کی حمد و ثنا کے بعد کہا: اے لوگو! میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہو۔ میرے اللہ! میں سخت دل ہوں، مجھے نرم کر دے اپنے اطاعت گزاروں کے لیے تیری خوشنودی اور دار آخرت حاصل کرنے کے لیے۔ مجھے اپنے دشمنوں اور منافقوں کے مقابلہ میں سختی عطا فرمانا۔ جس میں میری ذات کی طرف سے ان پر ظلم و زیادتی نہ ہو۔ اے اللہ مجھے اچھی باتوں میں خرچ کرنے کے لیے اور سختی کر دے جس میں غیر ضروری اور بے محل اسراف نہ ہو نہ دکھاوا ہو، اس میں تیری خوشنودی اور آخرت کی بھلائی ہی چاہوں۔ اے اللہ مجھے مسلمانوں کے لیے کشادہ دل اور مہربان بنا دے۔ اے اللہ مجھ میں غفلت اور نسیان بہت ہے مجھے اپنے ذکر کی اور موت کی یاد کی ہر حال میں توفیق دے۔ اے اللہ میں عمل میں کمزور ہوں مجھے اس کی امنگ اور قوت دے اور یہ اچھی نیت اور تیری توفیق سے ہی ممکن ہے۔ اے اللہ مجھے نیکی اور تقوی پر ثابت قدم رکھ اور تجھ سے حیا اور تیرے سامنے حاضر ہونے کی یاد دے مجھے وہ فروتنی عطا ہو جو تجھے مجھ سے راضی کر دے مجھے اپنے نفس کا محاسبہ کرنے، وقت کو اچھائی میں خرچ کرنے اور شکوک و شبہات سے بچنے کی توفیق عطا ہو۔ اے اللہ مجھے اپنی کتاب میں جسے میری زبان پڑھتی ہے تدبر و تفکر اور اس کے معانی اور

عجائب کو سمجھنے اور زندگی بھر اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ بیشک تو ہر بات پر قدرت رکھنے والا ہے۔

حضرت فاروق اعظم بھی اپنے خطبوں کے آخر میں چند مخصوص الفاظ کہتے تھے جو گویا ان کے خطبہ کے اختتام کا اعلان ہوتا تھا۔

اللّٰهُمَّ لَا تَدْعُنِي فِي عَمْرَةٍ وَلَا تَأْخُذْنِي عَلَى غُرَةٍ وَلَا تَجْعَلْنِي مِنَ الْغَافِلِينَ.

اے اللہ! مجھے اندھیرے میں نہ چھوڑ، لغزش پر نہ پکڑ اور مجھے غافلوں میں مت بنا۔

جب حضرت فاروق اعظم اس دنیا سے تشریف لے جانے لگے تو امانت و امارت کی امانت آپ نے مجلس شوریٰ کے سپرد کر دی، اس طرح ان کے دامن کو فتنوں کی ذمہ داریوں سے محفوظ رکھنے میں ان کے رب تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔

جب ارباب شوریٰ کے مباحث کے بعد حضرت ذوالنورین کو یہ امانت سونپی گئی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی تو وہ بھی خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، مگر شدت تاثر کے باعث حمد و ثنا اور شہادت کے بعد صرف دو چار لفظ ہی کہہ سکے۔

ولما ولي عثمان بن عفان رضي الله عنه قام خطيبا. فحمد الله

واثنى عليه تشهد ثم ارتج عيه فقال: ايها الناس ان اول كل امر

معيب. وسيجعل الله بعد عسر يسرا.

جب عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے خطبہ دینے کے لیے کھڑے

ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا اور رسالت کی شہادت کے بعد زبان رک گئی پھر کہا: اے

لوگو! ہر کام کی ابتدا دشوار ہوتی ہے، اللہ تنگی کے بعد آسانی دے گا۔

شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تاریخ اسلامی کا وہ المیہ ہے جس سے فتنوں کا دروازہ کھل گیا، امت میں وہ پراگندگی پھیلی کہ اگرچہ زمام حکومت امت کے بہترین فرد کے ہاتھ میں آئی، جو سابقون الاولون میں بھی سبق کا مقام رکھتا تھا جس کی تربیت دامن رسالت میں ہوئی تھی اور جس کی صداقت پر کسی قسم کی حرف گیری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ان فضائل کے علاوہ وہ امت کا بہترین سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خطیب بھی تھا مگر بے ترتیبی اور غیر صالح عناصر پر اعتماد

کے ہاتھوں انجام کتنا اندوہناک ہوا اس کا اندازہ اس خطبہ سے ہوگا جس میں شکست خوردگی اور جھنجھلاہٹ کی پوری کیفیت موجود ہے اور جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کا شیر دنیاوی گیدڑوں کے ساتھ رہ کر کتنا پشیمان ہے اور اپنے عزائم کے مطابق خدمت نہ کر سکنے نے اس کا دل توڑ دیا ہے۔

قال نافع ابن كليب دخلت الكوفة للتسليم على امير المؤمنين على رضى الله عنه. فانى جالس تحت منبره وعليه عمامة سوداء وهو يقول. انظروا هذه الحكومة فمن دعا اليها فاقتلوه وان كان تحت عمامتى هذه. فقال له عدى بن حاتم قلت لنا امس من ابى عنها فاقتلوه وتقول لنا اليوم من دعا اليها فاقتلوه والله ما ندرى ما نصنع بك. وقام رجل احذب من اهل العراق فقال. امرت بها امس وتنهى عنها اليوم. فانت كما قال الاول اكلك وانا اعلم ما انت. فقال على - ابى يقال هذا اصبحت اذكر ارحاما واصره وبدلت منها هوى الريح بالقصب اما والله لو انى حين امرتكم به ونهيتكم عما نهيتكم عنه حملتكم على المكروه الذى جعل الله عاقبته خيرا اذا كان فيه وكانت الوثقى التى تقلع ولكن متى والى متى اذا ويكم كانى والله بكم كناقش الشوكة بالشوكة. يا ليت لى بعض قومى وليت لى من بعد خير قوى. اولئك اخوانى الذاهبون فحق البكاء لهم ان يطيبا رزئت حبيبا على فاقة وفارقت بعد حبيب حبيبا ثم نزل تدمع عيناه. فقلت له ان لله وانا اليه راجعون على ما جرت اليه فقال نعم ان لله وانا اليه راجعون اقوامهم والله غدوة ويرجعون الى عشية مثل ظهر الحية. حتى متى والى متى حسبى الله ونعم الوكيل. نافع ابن كليب نے بیان کیا ہے میں امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کو سلام کرنے کے لیے کوفہ گیا، میں منبر کے نیچے ہی بیٹھا تھا، ان کے سر پر سیاہ عمامہ تھا اور کہہ رہے تھے: دیکھو یہ حکومت ہے جو اس کی طرف دعوت دے اسے قتل کرو خواہ وہ میرے اس

عمامے کے نیچے ہی کیوں نہ ہو۔ تو عدی نے کہا تم نے کل ہم سے کہا تھا جو اس سے انکار کرے اسے قتل کرو اور آج کہتے ہو کہ جو اس کی طرف بلائے اسے قتل کرو۔ خدا کی قسم ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ ایک شخص عراق والوں میں سے کھڑا ہوا اور کہا کل تم نے اس کا حکم دیا اور آج اس سے منع کرتے ہو تو تم ویسے ہی ہو جیسا پرانے کہہ گئے ہیں میں جانتا ہوں تم کیا ہو۔ علی نے کہا کیا مجھ سے یہ کہا جاسکتا ہے؟ میں تم سے ایک ہی باتیں کر رہا تھا اور اسے بیان کر رہا تھا اور تم نے اسے گھما پھرا دیا جیسے ہوائیں بانس کی جھاڑی کو۔ خدا کی قسم جب میں نے تمہیں حکم دیا اور جن چیزوں سے روکنا تھا روکا میں نے تمہیں ایسے سخت کام کے لیے ابھارا جس کا انجام اللہ نے اچھا کیا ہے اگر اس میں ہو، وہ مضبوط گرہ تھا جسے توڑا ہی جاتا ہے لیکن کب اور کب تک میں تمہارا علاج کرتا رہوں خدا کی قسم گویا کہ میں کانٹے کو کانٹے سے نکالتا ہوں۔ کاش میری قوم کے کچھ لوگ ہی میرے ساتھ ہوتے اور کاش اپنی قوم کے بہترین لوگوں کے بعد میں نہ ہوتا۔ وہ میرے چلے جانے والے بھائی ہیں ان پر رونا درست ہے اگر اچھی طرح ہو سکے۔ میں نے دوست کا رنج سہا اور ایک دوست کے بعد دوسرا چھوٹا۔ پھر وہ منبر سے اترے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے (نافع) نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون، تم کہاں پہنچے۔ انھوں (علی) نے کہا ہاں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں انھیں صبح میں سیدھا کرتا ہوں شام کو وہ سانپ کی پیٹ کی طرح بل کھائے لوٹتے ہیں، کہاں تک آخر کہاں تک؟ میرے لیے اللہ کافی ہے اور وہی اچھا وکیل ہے۔

یہ وہ خطیب ہیں جنہوں نے اسلامی خطبات کو وہ مقام بخشا جو عربی ادب میں خطابت کو اہم ترین صنف بنا گیا۔ (خطبات کا اقتباس ”العقد الفرید“ سے کیا گیا)۔





# مکاتیب ہادی

## بنام حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری

ہوا مقتدر

حضرت الشیخ دامت برکاتکم زید مجدکم وبارک اللہ لکم و فیکم

آداب و سلام و قدمبوسی غلامانہ معروض۔

عریضے ارسال کیے ہیں ملے ہوں گے، یا ملیں گے۔ پرسوں جمعہ کی صبح اچانک معلوم ہوا کہ اورنگ آباد والوں نے کل ہی عید منانے کا تصفیہ کیا ہے۔

یہ وبا بہت عام ہو گئی ہے کہ مختلف مقامات میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ عید منانا چاہیے، حالانکہ قدرت نے دن رات بھی ہر جگہ ایک ساتھ نہیں بنائے، اس لیے ساری دنیا میں ایک وقت پر سب ایک کام کر ہی نہیں سکتے۔

علماء نے جو کسی جگہ کی بھی شہادت آ جانے پر اسے تسلیم کرنے کا تصفیہ کیا تھا اور اختلاف مطالع کو نظر انداز کیا تھا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سفر کے وسائل اتنے بہتر تھے ہی نہیں کہ ایسی جگہ سے شہادت وصول ہو سکے جہاں مطلع بالکل مختلف ہے۔ اب جبکہ آمد و رفت کی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں صرف ان قریبی آبادیوں میں ہی ایک دوسرے کی شہادت ماننا چاہیے جن کا مطلع مختلف نہیں ہے۔ بعض وقت چاند نظر آنے کا امکان صرف چند منٹ ہوتا ہے تو ایسی جگہ جہاں اس وقت غروب ہو چکا ہو کہ مغرب کے مقام میں چاند نظر آنے کا امکان ہو وہ رویت سند نہیں ہو سکتی جو مغربی مقام میں ہوگی خود غیر منقسم ہندوستان کے مشرق و مغرب کے طلوع و غروب میں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ کا فرق ہے تو اگر کسی مغربی شہر میں غروب سے دس منٹ پہلے چاند نظر آئے تو مشرقی شہر میں تو اس وقت تقریباً عشا کا وقت ہو رہا ہوگا، وہاں رویت کیسے مانی جاسکتی ہے۔

بہر حال مجھ پر تو ذمہ داری ہے نہیں، وہ لوگ جو کچھ بھی نہیں جانتے ذمہ دار ہیں، میں تو

وار کعو مع الراکعین میں ہوں۔

ہمیشہ محتاج و طالب دعا خاص

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۶/۸/۱۸ء

بملاحظہ عالی میرساند

پرسوں عریضہ تحریر کیا ہے، دیر میں ڈالا گیا ہوگا۔ کل اتوار تھا اس لیے غالباً آج روانہ ہوگا۔  
طرح روانہ کی ہے یہ میری یاد کا غالباً پہلا مشاعرہ تھا، میرا مکتب ہو چکا تھا یعنی غالباً محرم  
۱۳۳۶ھ میں

”بہار آئی ہے اے پیرمغاں پھر دورِ ساغر ہو“  
ق ر

سب کی غزلیں ہوں گی، مولانا راغب کی غزل کلیات میں ہے۔ چچا مفتی ابوالحسن قادری کی  
غزل برسوں بعد ان سے پھر سنی تھی۔ اب میں طرح میں شعر کہہ رہا ہوں۔  
آپ کے دسیوں مرید آتے ہیں، ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں تم ہمارے پیر صاحب کے بھائی  
ہو، کسے کسے سمجھاؤں؟

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جاتی کہ درایں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست  
مناسب یہ ہے کہ آپ بھائی جان کہنا بند کریں اور ”قادری مُلا“ کہیں تو لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔  
قدیم اعتبار سے تو مُلا ہونے نہیں سکتا، اس کے لیے تو بحر العلوم سے رشتہ مضبوط ہونا چاہیے۔ بعد میں وہ  
مولوی کی کمتر قسم کے لیے بولا جانے لگا، اس میں مضائقہ تو نہیں کہ بہر حال مدرسہ قادریہ سے  
نسبت تو ہے ہی۔

ایک بات اور کم سے کم ”المعتقد المنتقد“ کی تصحیح باتھ سے کر دیجیے معتقد المنتقد  
چھپا ہے۔ یہ ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔ ”ال“ معتقد پر لکھ دیجیے کہ مرکب توصیفی ہے۔

سب پر سلامتی اور بس ہمیشہ محتاج و طالب دعا

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۶/۶/۳۰ء

پس نوشت :- یاد آیا کہ حضرت ابراہیم میاں رحمۃ اللہ علیہ مجھے ملا جیون فرماتے تھے، بس یہی  
ٹھیک ہے۔

ہوالمقتدر

حضرت الشیخ دامت برکاتہم زید مجدکم وبارک اللہ لکم ویکم  
آداب و سلام وقد مبوسی غلامانہ معروض۔

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ آپ کی دعا کی برکت سے سب خیریت ہے۔ امید کہ مزاج گرامی  
بخیر ہوگا اور سب مع الخیر۔ عریضہ لکھ چکا ہوں، مولانا سلمہ کی خیریت معلوم ہونے کا انتظار ہے۔  
کل شام اور نگ آباد گیا تھا، قافلہ کے ساتھ عائشہ سلمہ بھی جا رہی تھیں، شام کو واپس آ گیا۔  
وہاں اکرام میاں صاحب نے سنایا کہ انور میاں صاحب کا کہنا ہے کہ مدرسہ میں طلباء کے لیے بہتر  
سے بہتر کھانے کا انتظام کیا جائے۔ میرے سرکار مقتدر قدس سرہ نے بڑی باتوں کو منع فرمایا ہے،  
بہتر سے بہتر پڑھائی ہو مگر فقیری سے رشتہ نہ ٹوٹے۔ میں نے مولانا احمد دین صاحب کو دیکھا ہے  
لکڑی ٹیکتے دروازہ پر جاتے تھے، صدا لگاتے تھے، ”بڈھے مولانا کا کھانا“، بی پھوپیا لے میں  
دال اور چار چپاتیاں تھما دیتیں، وہ لیے ہوئے آتے اور مسجد کے حجرہ میں کھاتے۔ یہ مولانا حضور  
تاج القول سے صرف ایک سال چھوٹے تھے، ”احمد اغر“ تاریخی نام تھا، آخر تک اپنا کھانا مانگتے  
تھے جو حضور سیف اللہ المسلمول نے مقرر کیا تھا۔

درگاہ قادری میں لنگر گوشت روٹی قدیم ہے، چچا ستار بخش وغیرہ نے سرکار سے عرض کیا کہ  
کھانا اعلیٰ ہونا چاہیے، اجازت ہو تو ہم کریں۔ فرمایا ”مجھے کیا اعتراض ہے، مگر کر نہیں سکو گے“۔  
صرف ایک سال پلاؤ زردہ پکا، پھر سویرا۔ یہ روایت چچا مفتی کرم احمد نے سنائی تھی۔

میں تو اس خیال کا آدمی ہوں کہ مدرسہ قادریہ، آستانہ قادری اور زیب سجادہ سب ایک  
دوسرے میں مدغم ہیں، تفریق مناسب نہیں۔ پڑھنے پڑھانے پر زور دینا چاہیے، کھانے اور  
دکھاوے پر نہیں، واجب تھا عرض کیا۔ یہ بوڑھا غریب الدیار ضبط سے محروم ہو چکا ہے ورنہ اسے  
دخل در معقولات کا حق تو نہیں، وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد۔ استغفر اللہ  
ربی من کل ذنب واتوب الیہ وهو التواب الرحیم۔

سب پر سلامتی اور بس ہمیشہ محتاج و طالب دعائے خاص

گدائے خاک نشیں

۱۹۸۷/۷/۱۶ء

حضرت شیخ دامت برکاتکم زید مجدکم وبارک اللہ لکم ویکم  
آداب و سلام وقد مبوسی غلامانہ معروض۔

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ امید کہ مزاج سامی بخیر ہوگا اور اہل بیت مع الخیر ہوں گے۔  
عریضہ لکھ چکا ہوں، منی آرڈر بھی روانہ کر دیا ہے۔

کئی روز سے سوتے جاگتے اقبال علیہ الرحمہ کا ایک شعر دماغ میں پلچل مچائے ہوئے ہے  
ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی  
کہنہ کو یہ ایک شعر ہے مگر حق و باطل کی آویزش کی ایک مفصل تاریخ اس میں سموی ہوئی ہے۔  
”ازل“ تو زمانہ سے ماورا ہے، اسے تخلیق آدم سے ہی شروع کریں تب بھی کنت نبیاً و آدم  
بین السماء والطين سے معلوم ہوتا ہے کہ چراغ مصطفوی اس وقت بھی روشن تھا۔ ابلیس کا سجدہ  
سے انکار، اللہ سے انکار نہیں تھا، رسول اور اس کی عظمت سے انکار تھا اور اس سے وہ راندہ درگاہ ہوا،  
یعنی اللہ کے ساتھ رسول پر ایمان اور اس کی عظمت کے سامنے سر جھکانا بھی ضروری ہے، یہ نہ ہو تو  
کچھ بھی نہیں۔

اسلام تو سارے انبیاء و رسل کے ذریعہ ہدایت کرتا رہا ہے اور ابلیس بھی اپنے لاغورینہم کے  
دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ستیزہ کار رہا ہے۔

بعثت خاتم المرسلین ﷺ کے ساتھ ہی حق و باطل کی آویزش تاریخ کے سامنے ہے۔ ہر طرح  
شیخ نجدی ندوہ کی مجالس میں مشورہ دیتا رہا مگر جن دلوں میں اسلام نے گھر بنا لیا ان پر کوئی سختی کار  
گرنہ ہوئی اور ہجرت کے بعد دارالامن میسر آ گیا۔

باطل نے حق کو مٹانے کے لیے حرب و ضرب کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ایک اور محاذ بھی کھول  
دیا۔ نفاق زیادہ خطرناک ہے اس کے بعد سے منافقین نے نئی نئی تدبیریں کرنی شروع کر دیں۔

صاحب وحی تو سب جانتے ہی تھے ان سے کون چھپ سکتا تھا، انہوں نے جو جماعت پیدا کی  
اسے بھی نگاہ مرد مومن عطا فرمائی، اس سے بھی کوئی چیز چھپ نہیں سکتی تھی۔ حضور سیدنا فاروق اعظم  
رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے ”میں اس وادی میں خطاب کے اونٹ چراتا تھا، کام نہ کروں تو تھکا  
دیتے تھے، کوتاہی پر مارتے تھے اور آج اس وادی میں رات اس طرح گزاری ہے کہ میرے اور

اللہ کے درمیان کوئی نہیں (وما بینی وبين الله احد.) اللہ اکبر کس مقام کا اظہار فرمایا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ابلیس نے ایک نئی تدبیر اختیار کی، تشیع کی تخم کاری کی، اسلامی جمعیت کو اپنے پرائے کے نفسیاتی حربے سے پراگندہ کیا، اسلام تو مسلمانوں کو ایک خاندان بناتا ہے۔ ”اخوة“، مگر علی اور عثمان کو ماننے والے تقسیم ہو گئے، مگر بڑے مزے کی بات ہے سبط اکبر نبی کا نام شیعیان عثمان میں آتا ہے، وہ امت کو انتشار سے محفوظ رکھنے والا تھا۔ اب فرقے پیدا ہونے لگے رافضی انھیں میں سے، پھر خارجی، طاہری، باطنی وغیرہ کہاں تک گناؤں، وہابی اور قادیانی بھی سب شیطانی کاروائی ہے، وہی

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی  
 کام بہت بڑا ہے۔ رد بد مذہبوں کی کتب ہوں، معین بھائی جیسا قلم والا ساتھ ہو تو میں املا  
 کراتا جاؤں اور وہ خود بھی لکھتے جائیں مگر یہ سب کیسے ہو؟

سب پر سلامتی اور بس ہمیشہ محتاج و طالب دعا

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

یکم اگست ۱۹۹۰ء

ہوالمقتدر

حضرت الشیخ دامت برکاتکم زید مجدکم وبارک اللہ لکم ویکم

آداب و سلام و قد مبوسی غلامانہ معروض۔

اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی دعا کی برکت سے سب خیریت ہے امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور  
 سب مع الخیر ہوں گے۔

بعد انتظار شدید آج ۶/۱۵ کو ۶/۱۳ کا لکھا ہوا والا نامہ ملا۔ اس سے پہلے کوئی خط نہیں ملا جن کا  
 اس خط میں تذکرہ ہے، صرف صاحبزادہ سلمہ کی خوشخبری ملی تھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ عقیقہ اور نام رکھنے کے تعلق کی اصل کیا ہے۔ بہر حال یہ مروج ہے مگر ترمیم تو

ہو ہی سکتی ہے جیسا کہ میرے ساتھ ہوا کہ ”محمد“ نام رکھے جانے کے بعد زبردستی عبدالہادی ٹھونس دیا گیا جس سے عربی قاعدہ میں محمد بن عبدالہادی ہو گیا جو سر اسر غلط ہے۔

”عطیف“ بہت اچھا نام ہے (مہربان) اچھی صفت ہے مگر ”محمد عطیف“ عربیت کے خلاف ہے یا تو اس کا معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنا نام تبدیل کر لیا ہے اور یہ محمد بن عطیف ہیں کیونکہ عطیف محمد کی صفت ہو نہیں سکتی وہ معرفہ یہ نکرہ۔ ہاں محمد العطیف کہلائیں تو ٹھیک ہے مگر یہ ترکیب اس طرح بولی نہیں جاسکتی اس لیے یا تو نام صرف محمد یا صرف عطیف صحیح ہوگا۔ امام غزالی تو کئی پشت تک محمد بن محمد تھے۔ صارم تخلص آپ کو پسند آیا، مگر عطیف کے ساتھ اس کا میل نہیں، عطیف کی نرمی صدمہ کی شدت کیسے برداشت کرے گی اس لیے میرے خیال میں یہ تخلص آئندہ کے لیے محفوظ رکھیے۔ انھیں بسم کا تخلص دیجیے کیونکہ عطیف فعلیل صفت مشبہ ہے اس لیے وہ دوام یا مبالغہ چاہتی ہے، ”باسم“ سے بات نہیں بنے گی، مہربانی اور خندہ پیشانی میں خاص ربط ہے ہی جو ظاہر ہے۔

میری طرف سے سب کی خدمات میں آداب و سلام، دعا اور پیار، زیادہ بجز طلب دعا کے خاص کیا تحریر کروں۔

ہمیشہ محتاج و طالب دعائے خاص

محمد عبدالہادی القادری

۸۲۶/۱۸م

ہوالمقتدر

بملاحظہ عالی

کل ایک عریضہ طالب علمانہ حاضر کیا ہے۔ کیسا ہی ناقص سہی مگر ہوں مدرسہ قادریہ کا طالب علم۔ آج صاحبزادی حمیدہ سلمہا کا خط ملا۔ انھوں نے تحریر کیا ہے کہ صارم نام ہمیں پسند آ گیا۔ ان سے کلمہ سنخی نہیں کر سکتا۔

یاد آ گیا کہ ابونواس نے ایک شعر کہا، ایک لفظ غیر مانوس غیر واضح ترکیب میں استعمال کیا، اس پر بحث شروع ہو گئی کہ ابونواس بصریوں کی پیروی کرتا ہے، کسی نے کہا غلط یہ تو صاف کوفیوں کا

استعمال ہے۔ لوگوں نے سوچا ہم خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں، شاعر موجود ہے کیوں نہ اسی سے پوچھ لیں، ابونواس نے کہا میرا کام شعر کہنا ہے دلیلیں دینا تمہارا کام ہے، جاؤ خوب لڑو۔ اور ایک شاعر کا شعر سن کر کوئی نالائق طالب علم مدرسہ کے انداز میں گفتگو کرنے لگا، کسی نے شاعر کو سنایا کہ مدرسہ میں تمہارا شعر موضوع بحث بنا ہوا ہے، شاعر نے کہا ”شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد“، غرض کہ جب صاحبزادی سلمہا پسند کر چکی ہیں تو کچھ نہیں کیا جاسکتا حالانکہ یہ تو اردو شاعر نے ہی کہا تھا

میں ہوں ہنوز اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں  
مگر ساری باریکیاں اس لیے لغو ہیں کہ انھیں کون سمجھے گا؟ کون سمجھائے گا؟  
بارک اللہ لہم اجمعین۔

میری حالت اور حالات سب آپ پر عیاں ہیں۔ زیادہ مجال عرض نہیں۔  
سب کی خدمات میں آداب و سلام، دعا اور پیار

ہمیشہ محتاج و طالب دعائے خاص  
گدائے خاک نشین

محمد قادری

۱۹۸۲/۶/۱۹ء



## بنام حضرت عبد المجید اقبال قادری

ہوا مقتدر

زاویہ قادریہ

نام پلی حیدر آباد (دکن)

جان برادر حفظکم اللہ و محمد کم و بارک لکم و فیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مُلا صاحب (۱) کے مسودات مولوی عبد الرحیم صاحب نے مجھے بھیجے تھے میں نے رکھ لیے تھے، کثرت کار کے باعث فوراً دیکھ نہ سکا تھا۔ بدایوں میں انھوں نے مجھ سے تو کچھ دریافت نہ کیا مگر شیخ سے پوچھا کہ میں مسودات ساتھ لایا یا نہیں اور جب شیخ نے بتایا کہ ابھی انھوں نے دیکھے ہی نہیں ہیں تو انھوں نے اظہار تعجب کیا کہ اس کے مطالعہ میں اتنی دیر لگائی۔ شیخ نے مجھ سے یہ گفتگو لوٹادی، مجھے حیرت ہوئی کہ مجھ سے مطالعہ اور عجلت کی امید باندھی، حالانکہ میں تو طالب علم ہوں تنقید و تنقیح میرا کام ہے۔ خیر، اب اس کا سرسری مطالعہ جگہ جگہ سے کیا۔ پہلا تاثر تو یہ رہا کہ یہ کام ملا صاحب کو خود ہی ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا کیونکہ لیڈری اور واعظی سے تصنیف و تالیف کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان کے قلم میں نہ روانی ہے نہ یکسانیت، مگر یہ تلخ بات لکھتے ہوئے طبیعت ڈر رہی تھی کہ خواہ مخواہ انھیں سچی بات سے ملال ہوگا اور ممکن تھا کہ ابھی بہت دن اسی شش و پنج میں گزر جاتے کہ کیسے لکھوں؟ جھوٹ بھی نہ ہو اور برا بھی نہ معلوم ہو۔ مگر اتفاق سے اس وقت کے مطالعہ میں مجھے اپنی ذات سے متعلق پڑھنے کا موقع ملا جس کے بعد میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ مدرسہ قادریہ کے مختص نعت میں بھی گرفت فرماتے تھے اور ایک لفظ بھی حدود نعت سے زیادہ برداشت نہ کرتے تھے اور مُلا صاحب بے وجہ میری شان میں قصیدہ مدحیہ فرما رہے ہیں اور وہ بھی سراسر دروغ بے فروغ لا حول و لا قوۃ الا باللہ۔ وہ کہ عربی نثر بھی بلا تکلف فی البدیہہ نہیں لکھ سکتا ”وہ قصائد کہتا ہے جنہیں سن کر فصحاء عرب دنگ رہ جاتے ہیں“، استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔ جب ذرا اسی تمہاری خوشنودی کے لیے تمہارے بھائی کی جھوٹی تعریف کی جا سکتی ہے تو سیرت نگاری کا معیار معلوم، اللہم احفظنا۔

۱۔ ملا عبد الصمد مقتدری بدایونی نے حضرت عاشق الرسول کی سوانح تالیف کی تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (اسید الحق)

ان سے میری طرف سے معافی مانگتے کہ میں ان کے معیار کے مطابق نہ ادیب ہوں اور نہ محقق اور نہ ایسا خوش عقیدہ کہ ان باتوں پر بھی ایمان لاؤں جو میرے علم میں میرے مدرسہ کی روایات کے خلاف ہیں۔

اب اس سلسلہ میں زحمت اٹھانا میرے خیال میں وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر آپ کو صرف لفظوں کا گورکھ دھندا ہی چاہیے تو میں بیک جنبش قلم اس سے زیادہ کاغذ سیاہ کر دوں گا، مگر اس سے حاصل؟ میں نے اسی لیے تذکارِ محبوب میں یہ استدعا شائع کرائی تھی کہ جو صاحب بھی کوئی خاص معلومات رکھتے ہوں وہ شیخ کو بھیج دیں اور تمام مواد جمع ہو جانے پر آپ کا یہ خادم اس کی تنقیح کرے اور اس میں جو باتیں کسی طرح بھی قابل ذکر ہوں انہیں مختلف عنوانوں کے تحت ترتیب دے مگر وہ گزارش صدا بہ صحرا ہوئی اور اگر کسی نے اپنی معلومات بھیجی بھی تو وہ ملا صاحب نے اپنی تالیف میں شامل فرمائیں۔

پھر میں نے آپ کو لکھا کہ پاکستان میں مختلف حضرات سے ان کے تاثرات مانگیے۔ ان میں سے صرف سیدی زین کا نہایت عمدہ مضمون ملا جس کا ترجمہ معین بھائی نے بہت ہی خوب کیا ہے۔ اس مضمون سے چند باتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، حضرت اقدس کا ادب عربی پر عبور، قوت حافظہ، بدیہ گوئی، بذلہ سنجی، تیز ادراک اور ان کی ایمان افروز تلقینات۔

میں نے تو بہت سے لوگوں کے نام بھی آپ کو لکھے تھے، جو سب مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ سید طاہر علاء الدین گیلانی کا خط ان کی ہی زبان عربی میں انہیں کے ہاتھ کا ہونا چاہیے۔ بہت مشکل ہے کہ کوئی مبسوط چیز عرس سے پہلے تیار ہو سکے، مگر چند تاثرات اور ان کی تشریحات تو مرتب ہو ہی سکتی ہیں۔

انشاء اللہ یہ قرض باقی نہیں رہے گا اور مدرسہ اور اس کے اکابر سے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے گا اور وہ یہ کام اپنے ہی قلم سے لے لیں گے، آپ بھی دعا کیجیے کہ جلد توفیق رفیق ہو۔ حضرت شیخ کی ہم رکابی کی برکت ہے کہ سرکارِ سلطان الہند غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دربار میں مناقب پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور شیخ کے پہلو میں کھڑے ہو کر مواجہہ میں فاتحہ کے ساتھ پیش کیے گئے۔

فالحمد للہ، آپ بھی پیش کر دیجیے اور دعا کیجیے اللہ مجھے برکات دے (”مجھے“ میں بھی آپ، شیخ اور سب کو میں شامل سمجھتا ہوں کہ علیحدہ تو میرا کوئی وجود ہے ہی نہیں)۔  
مفصل خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیے، سب پر سلامتی،

تمہارا بھائی جان

ہادی القادری

۶۱/۱۲ء

ہوالمقتدر

جان برادر مولانا حفظکم اللہ وبارک اللہ لکم زید مجدکم ..... سلامتی رحمت اور برکات

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ خیریت ہے۔

کل فکری صاحب کے نام آپ کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ بلند آنے کا ہے، حماد قادری صاحب سلمہ بہت خوش ہیں کہ آپ آنے والے ہیں۔ اس وقت وہ نئے ڈاکٹر صاحب کو دکھانے نظام آرٹھوپیدک ہاسپٹل پنجہ گستہ گئے ہیں۔ کیا ٹھیک کہ کرشمہ نبی کے ظہور کے لیے ان ڈاکٹر کا علاج بہانہ بن جائے۔

فرید سلمہ نے صاحبزادے کی شان میں نثری قصیدہ لکھا ہے جو جذبات کی فراوانی کا آئینہ دار ہے۔ طول طویل نام لکھ کر خواہش کی ہے کہ میں آگے پیچھے اور اضافہ کر دوں۔ پہلے ہی نام بہت طویل ہو گیا ہے اس میں میری مداخلت زائد از ضرورت ہے۔

نام کے سلسلہ میں عربی معمول یک لفظی ہے یا اضافہ میں کنیت کا رواج ہے۔ دودو نام ایک کے لیے غیر عربی ہے۔

ایک لطیفہ سنو حضرت اقدس نے بصرہ سے پیر شمس الدین علیہ الرحمہ کو تار دینے کے لیے کہا، میں نے تار دے دیا اور آخر میں بھیجنے والے کا نام ہندوستانی طرز پر محمد عبدالقدیر قادری لکھا۔ تار پہنچنے پر عبدالقدیر شمس الدین نے کہا ”مولوی کیوں نہیں آ رہا؟“ پیر شمس الدین نے کہا ”وہی آ رہا ہے“، مگر وہ ماننے کو تیار نہ تھے اور کہتے تھے تار تو محمد کا ہے، مولوی کا تو کہیں ذکر نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ

طریقہ بھی عربیت کے خلاف ہے کہ ہر نام کے ساتھ محمد کا اضافہ کیا جائے۔

آپ کے صاحبزادگان کی پیدائش کے وقت نام تجویز کرنا میرے سپرد تھا۔ چنانچہ فرید اور مؤید میرے ہی رکھے ہوئے نام ہیں جنہیں حضرت اقدس نے پسند فرمایا اور یہی نام رکھے گئے۔ میں اس امر کی تصدیق یا تردید کچھ نہیں کر سکتا کہ حضرت اقدس نے عبدالرب نام تجویز کیا تھا مگر رکھا نہیں گیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اچھے نام وہی ہیں جن میں عبدیت یا حمد ہو (دونوں نہیں)۔ ”او“ یا کے معنی میں آتا ہے (محمد، احمد، محمود، حماد، حامد، جمید، حمید (تصغیر) سب کا تعلق حمد سے ہے، اس سلسلہ میں خالص عرب حمد اور حمدان بھی نام پسند کرتے ہیں۔

دوسرا لفظ باپ کا نام ہوتا ہے اس لیے احمد اقبال درست نہیں، احمد فرید اقبال قادری ہونا چاہیے، تیسرا لفظ دادا کا نام اور چوتھا نسبت۔

اگر آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ مؤید کے لیے عبدالرب حضرت اقدس کی تجویز تھی تو اصولاً یہ نام مؤید سلمہ کے بیٹے کا ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن میں ہے ”ہم نے اسحق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی“۔ یعقوب اسحاق کے بعد سیدنا ابراہیم کے لڑکے کی بشارت نہیں، اسحاق کے بیٹے کی بشارت ہے۔ مؤید کے سلسلہ میں عبدالرب بھی اسی قسم کی بات ہو سکتی ہے۔ ویسے یہ نام عبدیت سے متعلق ہونے کے باعث پسندیدہ ہے مگر حمد سے تعلق رکھنے والے نام کے ساتھ غیر ضروری ہے ”او“ کے معنی تو یہی ہیں۔

بہر حال جو نام بھی آپ سب کو پسند ہو وہ صحیح ہے مگر ہوگا وہی کہ صاحبزادے ”احمد“ کہلائیں گے اور پھر کسی کے لیے عبدالرب خالی رہے گا۔

خوارجہ میاں صاحب پوتے کے نام کے لیے مصر ہیں مگر میں گریز کر رہا ہوں کیونکہ جہاں کئی ناموں کا رواج ہو وہاں میرا کوئی نام تجویز کرنا بے کار ہے۔

خواجہ مخواہ قلم چل پڑا، بسکٹ، پیڑے، پڑی کی بات لکھنا تھی اور بس۔ بلکہ آتے وقت ضرور ساتھ لیتے آئیں۔

گدائے خاک نشیں

سب پر سلامتی اور بس

ہادی القادری

۸۱/۹/۸۱م

بنام مفتی عزیز احمد قادری بدایونی ثم لاہوری

ہوالمقتدر

مکرم و محترم ذوالجود والکرم استاذ معظم مدظلکم العالی وزید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ و ہدیہ آداب و نیاز پیش خدمت ہے۔

الحمد للہ کہ آپ کے اس حقیر و پر تقصیر تلمیذ کو عرس قادری (شوال المکرم) کے سلسلہ میں آستانہ قادریہ مجیدیہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

برادر محترم حافظ لطافت علی صاحب قادری مقتدری مع اپنی سدا بہار جوانی شرکت عرس کے لیے رُکے ہوئے تھے، ان سے مل کر خوشی ہوئی۔

انھوں نے آپ کی خیریت سے مطلع کیا اور اگر یاد رہا ہوگا تو آپ کی خدمت میں اس احقر خدام آستانہ کا سلام بھی پہنچایا ہوگا، بارک اللہ ہم۔

حضرت شیخ زیب سجادہ آستانہ قادریہ مجیدیہ دامت برکاتہم نے تفسیر عباسی کا جدید مطبوعہ نسخہ مجھے عطا فرمایا اور فرمایا ”دو نسخے ملے ہیں، غالباً ایک مدرسہ قادریہ کے لیے اور دوسرا تمہارے لیے ہے کہ نمبر ایک تلمیذ ہو“۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ تلمیذ نمبر ایک کیا ہوتا ہے۔

تفسیر عباسی (ترجمہ اردو) اور ترجمہ قادری اپنے ساتھ حیدر آباد لیتا آیا۔ انشاء اللہ تفصیلی مطالعہ کروں گا اور ایمان تازہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

مجلد سامنے ہے، کھولنے سے پہلے خیال آیا کہ استاذ مدظلہم کے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہیں بلاغت اور صنائع بدائع سے واقف، ورنہ ایک عامی تو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ لف و نشر مرتب کس چڑیا کا نام ہے اور پھر تفسیر ابن عباس سے پہلے ”ترجمہ اردو“ محذوف ہے، یقیناً سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اردو نہیں آتی تھی، انھوں نے تفہیم قرآن لغت ضاد میں ہی کی ہوگی اور ہم جیسے اردو خوانوں کے لیے سرکار صاحب اقتدار قدس سرہ نے اسے اردو میں منتقل فرمادیا کہ ترجمان القرآن رضی اللہ

عنہ سے استفادہ کر سکیں۔

تفسیر ابن عباس کے نیچے ”بمعہ“ تو میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، ”ب“ خود ”مع“ کے معنی میں آتی ہے، یہ ”مع مع“ کیا ہوا؟ میرے خیال میں آئندہ طباعت میں تصحیح فرمائی جائے۔

القرآن المجید

مع

ترجمہ قادری

از

حضرت مولانا مفتی عزیز احمد قادری مقتدری صاحب مدظلہم العالی

بر حاشیہ

تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما

اردو ترجمہ

از

حضرت مولانا عبدالمقتدر مطیع الرسول قادری بدایونی قدس سرہ

بہر حال یہ ایسی فروگزاشت ہے جس پر عام طور پر توجہ نہیں کی جائے گی، مگر مدرسہ قادریہ کا بور یہ نشین اور آپ کا ناقص شاگرد تو اسے مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی انگشت نمائی کا موقع فراہم کیا جائے اور وہ بھی کسی خام کار کی طرف سے نہیں، ایک فاضل اجل کی طرف سے جو میرا استاذ اور محقق مفتی ہے، میری نگاہ تصور میں ہنوز وہ مناظر تازہ ہیں۔

(۱) حضرت اقدس ابی قدس سرہ کو حیدرآباد میں خبر ملی کہ استاذی حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن قادری علیہ الرحمہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت اقدس قدس سرہ نے انتہائی تاثر میں فرمایا ”آج مدرسہ قادریہ سے فقہ ختم ہو گیا“۔

(۲) عرس قادری (محرم الحرام) کے لیے بدایوں تشریف آوری ہوئی، آپ کو یاد فرمایا اور کہا ”عزیز احمد! مولانا حبیب الرحمن کے بعد فتاویٰ کون لکھے گا؟“ پھر فرمایا ”تم یہ کام کرو“۔

(۳) سال بھر بعد پھر عرس قادری (محرم الحرام) میں تشریف آوری ہوئی، آپ کو یاد کیا، کوئی مسئلہ (مسئلہ یاد نہیں رہا) پوچھا، آپ کے جواب پر خوش ہوئے، پھر مجھ سے فرمایا ”الحمد للہ عزیز احمد نے محنت کی، ابھی مدرسہ قادریہ سے فقہ نہیں اٹھا“ نہ جانے کیا کیا یاد آنے لگے  
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

سرورق میں ہی الجھ کر رہ گیا، کتاب کھولوں اور کہوں۔  
ہر گام نیا طور نئی برق تجلی اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے  
(فانی)

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ ”عرض ناشر“ سے جو مضمون شروع ہوا ہے اور ”محمد عبدالحکیم شرف قادری“ پر ختم ہوا ہے، اس میں ذیلی عناوین بھی ہیں اور دو جگہ آپ کے دستخط ”فقیر عزیز احمد قادری“ اور ”فقیر سراپا تقصیر عزیز احمد قادری بدایونی ثم لا ہوری“ ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں زیادہ روانی سے لکھ سکتا تھا، اب جبکہ آپ کے دستخط ہیں نہایت ادب سے بعض اصولی باتیں کروں گا جن سے اختلاف شاید انا ولا غیر کی بدست بھی نہ کر سکیں۔

حضور سیف اللہ المسلمول کا سنہ وصال آپ نے میلادی (عیسوی) لکھا ہے۔ میرے پاس ایسی تقویم ہے نہیں جس سے سنہ میلادی و سنہ ہجری کی مطابقت کروں، درگاہ قادری میں جو تواریخ وصال لگی ہوئی ہیں ان کا اختتام ”المؤرخ عبدالقادر“ پر ہوتا ہے جس سے ۱۲۸۹ھ معلوم ہوتا ہے، آپ خود ہی دیکھیں اور مطابقت کر لیں۔

سرکار صاحب اقتدار قدس سرہ کے تلامذہ کی فہرست میں تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا۔ پہلے دور میں مفتی محمد ابراہیم، مفتی حسین احمد، مولانا عبدالمجید اور سید احمد حسین جیلانی یہاں ان کے ساتھی تھے۔ آکا (ماجد میاں)، مولانا راغب، مفتی صدیق، مولانا قدیر بخش دوسرے دور کے ساتھی تھے۔ مولانا مفتی حبیب الرحمن اور ان کے ساتھی تیسرے دور میں آتے ہیں۔ حضرت اقدس قدس سرہ چوتھے دور میں آتے ہیں۔ مولوی جمیل احمد، سید حسن، ستاری بھائی وغیرہ علیہم الرحمہ اور آپ خود آخری دور میں آتے ہیں۔

سرکار رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سید شاہ مصباح الحسن مودودی علیہ الرحمہ کا نام غلط ہے، ہاں وہ مولانا مفتی محمد ابراہیم علیہ الرحمہ کے شاگرد ہیں لہذا سرکار سے بالواسطہ شاگردی ہے، براہ راست نہیں۔ مولانا مفتی محمد ابراہیم علیہ الرحمہ زکریا مسجد میں نہیں تھے، کھڑک کی مسجد میں تھے۔ حضرت شاہ عین الحق قدس سرہ کو شمس مارہرہ قدس سرہ نے تمام سلاسل قدیمہ و جدیدہ میں مجاز بیعت فرمایا ہے اور خزانہ دار بنایا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ ”سلسلہ عالیہ قادریہ اور چشتیہ نظامیہ دونوں میں مجاز بیعت تھے“۔

”اس ترجمہ کی ضرورت“ میں جو آپ نے تحریر فرمایا ہے، درست ہوگا اب میں رضوی ترجمہ اور قادری ترجمہ دونوں کا تقابلی مطالعہ کروں گا۔ میرے پاس رضوی ترجمہ والا قرآن مجید ہے، میری بیوی مرحومہ اس کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ بچیوں کو بھی میں نے اسی ترجمے کے قرآن دیئے ہیں، مگر مجھے خود کبھی ترجمہ پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

حکیم مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا۔  
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہوں نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ راری نہ صاحب کشف  
خود ہی کوئی بات سمجھ میں آجائے تو بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال انشاء اللہ اب دونوں کا مطالعہ کروں گا، والا امر بیدہ تعالیٰ۔

یہ خامہ فرسائی آپ کے دستخطی حصوں سے متعلق تھی، اب ذرا عرض ناشر پر بھی نگاہ ڈالوں کہ تنبورہ ماچمی سراید۔ شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ کو قرآن کے اردو ترجمہ میں اولیت حاصل ہے اور جب تک ان سے متقدم کسی کی کاوش نہ ملے اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ ”تعارف تفسیر عباسی کی خصوصیات“ کی ابتدا ”حامداً و مصلياً و مسلماً“ سے کی گئی ہے۔ پہلے دو صفت کے صیغے ہیں تیسرا مصدر؟ سب کو ایک سا ہونا چاہیے۔

حضرت استاذی مولانا مفتی حبیب الرحمن قادری علیہ الرحمہ جب سوال سن کر جواب مجھے املا کراتے تھے تو فرماتے تھے لکھو ”مبسملًا و حامداً و مصليًا و مسلماً“، یہ مبسملًا اور مسلماً میں نے کسی اور کی تحریر میں نہیں دیکھا۔ غالباً یہ الفاظ آپ نے جناب ناشر کو لکھ کر دیئے اور



ان سے پڑھے نہیں گئے۔ مبسلاً تو ان کے گلے سے اترا ہی نہیں، مسلماً کو مسلماً کر دیا۔  
نقل راہم عقل باید۔

صرف ایک سطر میں تفسیر عباسی کا تعارف ختم ہو گیا۔ آگے تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعارف ہے اور تعارف کی تان ”آپ مہندی کا خضاب لگاتے تھے“ پر ٹوٹی ہے۔  
عرض ناشر نہ سہی، تعارف تفسیر و صاحب تفسیر آپ کو خود لکھنا چاہیے تھا خواہ اس پر دستخط ناشر صاحب کے ہی ہوتے۔

ناشر نے آپ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ آپ سے پوچھ کر ہی لکھے ہوں گے میں ان میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ ہاں اس پر تعجب ضرور ہے کہ اساتذہ کی فہرست میں سرکار صاحب اقتدار قدس سرہ اور حضرت اقدس قدس سرہ کا تذکرہ نہیں، ممکن ہے سرکار استغراق میں رہتے ہوں، اس کے باوجود تیرکا ہی سہی کوئی کتاب ان سے شروع ضرور کی ہوگی ”من علمنی حرفاً“ میں تو وہ آ ہی جاتے۔  
مولانا مفتی حبیب الرحمن علیہ الرحمہ حضرت اقدس قدس سرہ سے کچھ ہی متقدم تھے مگر انھیں اپنا استاذ کہتے تھے مجھے بتایا کہ سرکار کسی گاؤں تشریف لے جا رہے تھے عرض کیا ”میرے درس کا کیا ہوگا؟“ فرمایا ”حبیب الرحمن سے پڑھ لینا“۔ صرف ایک درس کی بنا پر ان کی استاذی کا اعتراف فرمایا۔

حضرت اقدس قدس سرہ نے سرکار کے حکم سے مسند درس آراستہ کی تھی، آپ سے پہلے کے طلبہ بھی ان کے شاگرد ہیں، خاص طور پر یونیورسٹی کے امتحان دینے والے تو سب ان کے شاگرد تھے، پھر آپ نے ان سے ایک حرف بھی نہ پڑھا، بات عجیب سی لگتی ہے۔

یہ پڑھ کر کہ آپ نے حدیث کی تکمیل مولانا ابراہیم علیہ الرحمہ سے کی ہے امید کی ایک کرن نظر آئی، انھوں نے آپ کو سند حدیث مسلسل ضرور دی ہوگی، مجھے اس کا عنعنہ چاہیے۔ میں نے سند حدیث مسلسل کے لیے حضرت اقدس قدس سرہ کو حدیث سنائی، انھوں نے سند مسلسل زبانی سنائی، میں لکھ نہیں سکا، فرمایا ”ہم خود کسی وقت لکھ دیں گے“۔ ناسازی مزاج نے مہلت نہ دی، میں تحریری سند سے محروم رہ گیا حالانکہ حدیث سنانے اور سند سن لینے سے میرا سلسلہ تو مکمل ہے مگر

دوسرے کو سند دے نہیں سکتا۔ مولانا حبیب الرحمن مرحوم (الشہیرہ مجاہد ملت) آئے، سند چاہی میں نے کہا مجھے حدیث سنائی نہیں میں سند کا ہے کی دوں؟ انھوں نے کہا ”بھئی جا کر زر سنگ ہوم میں حضرت اقدس کو حدیث سنائی ہے اور سند سنی ہے، اب تم سند دے دو“، میں نے کہا یہی بد نصیبی میرے ساتھ ہے سند سنی لکھ نہ پایا۔

اگر آپ مولانا ابراہیم علیہ الرحمہ کی عطا کردہ سند کی نقل بھیج دیں تو میں سرکار قدس سرہ کے بعد حضرت اقدس قدس سرہ کا نام اور اپنا نام جوڑ لوں گا اور دوسروں کو سند سنا سکوں گا۔

”(بڑھے مولوی صاحب) مولانا احمد الدین صاحب علیہ الرحمہ کو متون یاد تھے، وہ آپ جانتے ہوں گے، میرے ساتھ تو یہ لطفہ ہوا ہے کہ میں شرح جامی پڑھتا تھا اور وہ سامنے نحو میر رکھتے اور فرماتے ”ملا صاحب نے کیا بات کہی میر صاحب لکھ گئے ہیں“۔ نحو میر کی تشریح ملا جامی کے مطابق کرتے۔

عمر ۹۹ سال ہوئی، ”احمد غز“ تاریخی نام ہے۔ درگاہ قادری میں قبر پر کتبہ ہے، عمر ۹۹ سال تحریر ہے، ایک سو دس سال درست نہیں۔

آپ کی بیعت کا ذکر ”غالباً“ سے کیوں شروع ہوتا ہے، اس میں شبہ کیا ہے، عرس قادری (جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ) میں آپ اور ساتھی اور متقدم داخل سلسلہ ہوئے۔ غالباً یہ سب سترہ تھے، ان میں حافظ لطافت علی صاحب اور آپ دونوں لاہور میں ہیں۔

اسی ذیل میں تاج الفحول محبت رسول مولانا شاہ ”محمد عبدالمتقندر“ قدس سرہ العزیز لکھا گیا ہے ”عبدالقادری“ ہونا چاہیے۔

بیعت کے بعد اس کا تذکرہ بھی ضروری تھا کہ حضرت اقدس قدس سرہ نے آپ کو مجاز بیعت فرمایا ہے۔ ذلک فضل اللہ يعطيه من يشاء۔

عیب دے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

تلامذہ کی فہرست میں نمبر ایک اس نالائق کا نام ہے۔ یہ میرے لیے باعث صداقت رہا ہے کہ اکابر تک سلسلہ درس کی سند آپ نے دے دی۔ اگرچہ میں ان تہی دامن قسمت میں ہوں جن

کے لیے رہبر کامل سودمند نہ ہونے کا اشارہ ایک مرد کامل کر گیا ہے۔ میں اپنی نالائق اور محرومی تسلیم کرتا ہوں، اس کے باوجود فیوض اساتذہ کا قائل ہوں۔ جس روز صبح کالج میں پہلا درس دینا تھا شب میں مولانا حبیب الرحمن علیہ الرحمہ تشریف لائے، میں نے عرض کیا آپ کا تو انتقال ہو چکا، فرمایا میں اب بھی تمہیں پڑھاؤں گا۔ آنکھ کھلی تو قصیدہ بردہ کا یہ شعر زبان پر تھا

”وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُولِ اللَّهِ نَصْرَتَهُ.....الْح“

حضرت اقدس کو خواب سنایا، فرمایا مولانا حبیب الرحمن شہیدوں میں شامل ہوئے، زندگی دوام شہید کو ہی ملتی ہے اور یہ شعر تمہیں عطا ہوا، ورد کرو۔

چھتیس (۳۶) سال فیوض کا مشاہدہ ہوتا رہا، جن کا نام نہ سنا تھا وہ کتابیں پڑھائیں۔

میرا نام ”محمد“ ہے صرف محمد، عبدالہادی تو لاحقہ ہے۔ اب تو بس ہادی القادری رہ گیا ہوں۔ سرکار قادری کا مدح خواں شاعر جو ہوں۔

میں شعبہ ادب عربی میں مدرس تھا، اسلامیات میں نہیں۔

آپ کے نمبر ایک شاگرد مفتی احمد یار خاں مرحوم تھے، میرا نام تو بہت بعد میں ہونا چاہیے، تب بھی باعث صداقت رہی ہوگا۔ آئندہ اشاعت میں تصحیح فرمادیں، سب پر سلامتی اور بس۔  
گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۸۱/۹/۲۵ء

پس نوشت: ثنی بخد مت سامی حضرت الشیخ زیب سجادہ قادریہ مجیدیہ دامت برکاتہم  
مرسل ہے کہ کتب خانہ مدرسہ قادریہ میں ترجمہ قادری کے ساتھ محفوظ رہے۔

## بنام ڈاکٹر اسعد بدایونی

ہوالمقتدر

زاویہ قادریہ

341-6-5 نام پبی، حیدرآباد (اے پی)

عزیزی اسعد اللہ وبارک لک سلامتی، رحمت اور برکات، بہت سی دعائیں ڈھیروں پیار سب سے پہلے تو اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ تم نے فکری صاحب سلمہ کو اپنا مجموعہ (۱) بھیجا اور میں نے انہیں پہنچانے سے پہلے کھول لیا اور بیک نشست سرسری نگاہ ڈال گیا۔ کتاب ہاتھ آئے اور اسے نہ پڑھوں یہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اب تو غلطی ہو ہی گئی، تم بھی معذرت قبول کر لو تو آگے چلیں۔ کیوں تو آگے پڑھیں؟

بسم اللہ کتاب کھولی، مصنف کا مختصر تعارف نظر پڑا، خوشی ہوئی کہ صاحبزادہ میں صلاحیت باقی ہے۔ ابتدائی مشیر کی حیثیت سے ہی سہی پیام صاحب کا نام لکھا ہے، اگر ابتدائی مشورے کی قید نہ ہوتی تو زیادہ خوشی ہوتی، مجھے دیکھو بوڑھا ہو گیا ہوں مگر سرکار قادری میں کوئی نعت منقبت ایسی پیش نہیں کرتا جس میں استاذ علیہ الرحمہ اور دوسرے پیشرو مداحوں کا تذکرہ نہ ہو، حالانکہ استاذ علیہ الرحمہ نے سوائے منہ چومنے اور شاد باشی دینے کے اور کچھ نہیں کیا۔ میں نے استاذ بناتے وقت یہ شرط رکھی تھی میرے شعر میں اصلاح سازی نہیں ہوگی، انہوں نے وعدہ کر لیا تھا مگر شگردی میں قبول کرنے کی جو شرط رکھی تھی وہ خود ایسی کڑی تھی کہ اس کی طرف خیال رکھوں تو پھر استاذ کا کام خود بخود ہو جاتا ہے اور اب صرف شاد باشی دینا اور منہ چومنا ہی اس کی ذمہ داری رہتی ہے۔

بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ استاذ نہ سہی مشیر اور صرف ابتدائی مشیر سہی مگر تم اس کا نام لکھنے سے ہچکچاتے نہیں۔ اللہ برکت دے۔

شعر خواہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے ہی کہا جائے، لفظ اور زبان کے استقام سے تو اسے

۱۔ ڈاکٹر اسعد بدایونی کا مجموعہ کلام ”دھوپ کی سرحد“ خالد بدایونی کی ترتیب سے ۱۹۷۷ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ ہم جناب وارث رفیع بدایونی کے شکر گزار ہیں جنہوں نے یہ مجموعہ فراہم کیا، اسی کی مدد سے ہم نے حاشیہ میں وہ اشعار درج کر دیے ہیں جن کی طرف مکتوب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پاک ہونا ہی چاہیے اور اگر اسے کسی دوسرے کو سنانا بھی ہے تب اس میں ابلاغ اور ترسیل کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔

علامتوں کا استعمال کوئی جدت نہیں ہے۔ مرزا نوشہ نے بھی کہا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر مگر مرزا نوشہ اور ان سے آگے پیچھے رہنے والوں کو منجھی منجھائی علامتیں ملی تھیں، جن کا سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہ تھا۔ ممکن ہے ایک صدی بعد آج پیدا کی جانے والی علامتیں بھی سمجھی جانے لگیں۔ مگر فی الحال جب تک خود شاعر نہ بتائے کہ اس نے چھبر بہادری کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے کوئی سمجھ نہ پائے گا کیونکہ ہر شخص کو تو یاد نہ ہوگا۔

پشہ سے سیکھے شیوہ مردانگی کوئی جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے خیر یہ بحث بہت طولانی ہے اور مجھے تمہاری جولانی طبع پر کوئی روک بھی نہیں لگانا ہے جو دیکھو، سمجھو وہ کہو اور خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہو۔ میں سمجھ پاؤں یا نہ سمجھوں اس سے غرض نہیں۔ طبع موزوں ہے، علم اور مشق خود راہبری کریں گے۔

اچھا تو اب میں یہ ثبوت پیش کر دوں کہ میں نے سرسری ہی سہی مگر نگاہ ڈالی ہے۔ ”ص“ صفحہ کی اور ”س“ سطر کی نشاندہی کریں گے پھر ایک بار یہ بتا دوں کہ یہ صرف تمہارے مطالعہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ خود دیکھو اور غور کرو، کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

ص ۸/۳۔ ”تک“ (۱) سے قطع نظر کہ متروکات میں ہے ”وصالوں“ ہرگز صحیح نہیں۔ وصل دس ہزار بار بھی ہو تو وصل ہی کہلائے گا۔ س ۵ ”اس سے ہوئیں“ (۲)، ”اس“ اسم اشارہ اور ضمیر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اشارہ ہو تو مثلاً الیہ ہونا چاہیے، ضمیر ہو تو مرجع ہونا چاہیے، یہ شاید کوئی تیسری قسم ہے۔

ص ۹/۶۔ ”سنو“ (۳) یا تو حشو محض ہے یا دیکھو کے معنی میں استعمال کیا ہے، دن کے ساگر میں موج دیکھی جاسکتی ہے سنی نہیں جاسکتی۔

ص ۱۲/۱۱۔ ”ہوائے وقت“ (۴) ہوا بمعنی خواہش فارسی لفظ ہے، فارسی ترکیب سے استعمال ہوتا ہے مگر ”ہوا“ بمعنی باد اُردو ہے اسے فارسی ترکیب سے استعمال کرنا غلط ہے، وقت کی ہوا کہہ

سکتے ہیں۔ س ۱۴ ”ہاتھ“ (۵) کے لیے کتر نا ادب میں اضافہ ہے اور پھر فعل لازم تو اور بھی کمال ہے۔

س ۱۵ ”روایتیں“ املا کی غلطی ہے، روایت سے روایتیں ہونا چاہیے، بدواں لہجے کا اثر ہے۔  
 ص ۱۴/س ۷ ”اس“ کا نہ مشاڑا الیہ ہے نہ مرجع۔ ”گلاب“ نزاکت و لطافت کی علامت ہے، (۶) جمع سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہاں اگر ”گلابوں“ میں ”ں“ نہ لکھا ہوتا تو ایک بات بھی تھی، ”گلابو“ کسی نازک لڑکی کا نام ہو سکتا تھا۔

ص ۱۵/س ۷- خزینہ اور ذخیرہ میں فرق ہے (۷)، ذخیرہ کسی چیز کے ڈھیر کو کہتے ہیں، خزینہ کسی جگہ رکھی ہوئی چیز کو۔ نفرت دل یا دلوں میں رہ سکتی ہے دلوں کا ڈھیر نہیں لگا سکتی۔

ص ۱۶/س ۱۱- میرامن کی باغ و بہار پڑھو ”بدن“ جسم کے مخصوص حصہ کو کہتے ہیں (۸)  
 ص ۱۸/س ۳- لفظ دکان ہے (۹) بغیر واو۔ س ۶، ۵ عجیب بات ہے ردی کو الماری میں جمع کرنے کا شوق بہت ہی نادر ہو سکتا ہے (۱۰)، ویسے ردی دال پر تشدید کے ساتھ بھی غلط ہے۔

ص ۱۹/س ۳- قلم کی لغزش کے سوا کچھ نہیں مگر سفیر کا رنگ سپید پڑ گیا (۱۱)۔  
 ص ۲۱/س ۱۰، ۹- ریکنڈار اور لالہ زار میں سے کوئی ایک ہی صحیح ہوگا (۱۲) دوسرے کو بھی ویسا ہی کر لوڈ سے یاز سے۔

ص ۲۵/س ۸- مثال اور مثل دونوں بالکل علیحدہ ہیں ”ضرب“ کے معنی بیان کرنا ہیں جو مثل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے (۱۳)۔ س ۱۱ ”ہوا“ پھر فارسی ترکیب کے ساتھ (۱۴)۔  
 ص ۲۷/س ۶- آواز دینا محاورہ ہے لگانا نہیں (۱۵)۔

ص ۲۸/س ۳- واقعاتی غلطی ہے، جب سورج سر پر ہوتا ہے زرد نہیں ہوتا، طلوع و غروب کے وقت زرد ہوتا ہے (۱۶)۔

ص ۳۴/س ۴- ”طرح“ دو طرح مستعمل ہے اور دونوں طرح جائز ہے، ”رح“ دونوں ساکن یا ”ز“ متحرک اور ”ح“ ساکن، مگر تم نے ”ز“ ساکن اور ”ح“ متحرک باندھی ہے (۱۷)، یہ درست

نہیں۔ ۶ ”صحیح“ کی ”ح“ بھی ساکن ہے اس کو بھی متحرک باندھا ہے (۱۸)۔  
 ص ۳۸/۷۔ ”سہم سہم“ کی ”ہ“ بھی متحرک باندھی ہے (۱۹)۔  
 ص ۳۹/۱۱۔ ”دوپہر“ باعلان ”و“ ہو تو ”پہر“ کی ”ہ“ متحرک ہونی چاہیے ورنہ ”و“ کا اعلان درست نہیں (۲۰)۔ ۱۲، پھر وہی ”بدن“، بابا یہ گالی ہے۔  
 ص ۵۰/۳۔ ”چٹان“ ”ٹ“ مشدد کے ساتھ باندھا ہے (۲۱)، حالانکہ اس سے پہلے یہ لفظ ”ٹ“ خفیف کے ساتھ تم نے خود باندھا ہے۔ ایک ہی صحیح ہوگا۔  
 ص ۵۲/۱۰۔ ”اس“ کا نہ مشار الیہ ہے نہ مرجع (۲۲)، کوئی سمجھے تو کیا سمجھے۔  
 ص ۵۳/۹۔ بخیل، اسم صفت ہے۔ اس سے پھر صفت نسبتی بنانا درست نہیں۔ ”بخیلی“ سے شاید تم بخل کہنا چاہتے ہو (۲۳)۔  
 ص ۶۰/۱۰۔ صوتی قوافی کا چلن ہو تو رہا ہے، مگر ہے غلط (۲۴)۔  
 ص ۶۱/۱۰۔ واردات خود ہی جمع مونث سالم ہے، اس میں ”ون“ کا اضافہ درست نہیں (۲۵)۔  
 ص ۶۵/۲۔ پھر وہی وصال بصیغہ جمع اور لطف یہ کہ بہت سے وصال کے بعد بھی مزاح توڑا ہی چکھنے کو ملے (۲۶)۔ ۴ جب حادثہ کو دن بیت چکے تب تو صف ماتم اٹھانے کا وقت آیا نہ کہ بچھانے کا (۲۷)۔  
 ص ۶۶/۱۲۔ ”مضافات“ جمع و مونث سالم ہے، ”ون“ سے پھر جمع بنانا درست نہیں (۲۸)۔  
 ص ۶۹/۱۲۔ ”صحراؤں“ بصیغہ جمع ہے تو ازاں بھی بصیغہ جمع ہونا چاہیے تاکہ فی صحرا ایک ازاں کا حساب تو پڑ جائے، دوسرے یہاں ”ازاں“ صرف صدا کے معنی میں ہے (۲۹)، حالانکہ لفظ منقول پھر اصلی معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔  
 ص ۷۸/۷۔ ”کوئی“ حرف تنکیر ہے (۳۰)، ”تو کوئی پارہ“ تو کہا جاسکتا ہے۔ ”سی پارہ“ تو پورا قرآن ہوا، جسے تیس اجزا میں تقسیم کر لیا ہے، سی کا معنی تیس ہے، اسی لیے سی پارہ کہتے ہیں یعنی تیس حصے۔

اب تو ماننا ہی پڑے گا کہ سرسری ہی سہی مگر میں نے نگاہ ضرور ڈالی ہے، نشان لگا تا گیا تھا، بعد میں ورق گردانی کا ماحصل تمہیں لکھ دیا، ممکن ہے بعض فی الفاظ ابھی تمہاری سمجھ میں نہ آئیں، مگر

مطالعہ کرتے رہو، استاذ سے کسب فیض کرتے رہو، سب جان جاؤ گے۔  
 ان تمام آڑی ٹیڑھی لکیروں کے باوجود ایک شعر ایسا بھی نگاہ سے گزرا کہ میں نے اس پر  
 ”✓“ نشان لگایا، وہی ایک شعر تم سے امید وابستہ کرنے کے لیے کافی ہے، ناہمی کا احساس ہے  
 تو وہی تکمیل کی ضمانت بنے گا، اس وقت تم سامنے ہوتے تو ضرور منہ چوم لیتا۔  
 نہ اپنے گھر کا پتہ ہے نہ منزلوں کا سراغ مری طرح کوئی دنیا میں بے نشان بھی نہ ہو  
 زندگی ہے تو انشاء اللہ عرس قادری میں حاضری کی سعادت حاصل کروں گا۔  
 سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۷۸/۸/۴م

(حواشی)

- ۱۔ کب تک جیتے وصالوں کی تمنائوں میں لوگ ☆ زندگی سے ایک دن بیزار ہونا تھے، ہوئے
- ۲۔ اور تھے وہ جن کو جاگیریں عطا اُس سے ہوئیں ☆ اپنی قسمت میں تو بس فنکار ہونا تھا، ہوئے
- ۳۔ پھر شام لے کے آنے لگی درد کے چراغ ☆ پھر دن کے ساگروں میں سنو موج شب چلی
- ۴۔ ہم کو ہوائے وقت نے دی ہے شکست بارہا ☆ سیپ کی طرح بند تھے گل کی طرح بکھر گئے
- ۵۔ شعر کہوں تو کس طرح، نظم کہوں تو کیوں بھلا ☆ میری زبان چھن گئی، ہاتھ مرے کتر گئے
- ۶۔ میں اب بھی اس کو گلابوں کی طرح جانتا ہوں ☆ کہے ہزار زمانہ اسے کہ پتھر تھا
- ۷۔ سوچو تو نفرتوں کا ذخیرہ ہر ایک دل ☆ کرتے ہیں یوں تو یار کا اظہار سب کے سب
- ۸۔ ہے لوحِ ترے نرم بدن کا سادھنک میں ☆ موسم نے ترارنگ چرایا بھی بہت ہے
- ۹۔ شہر کی دوکانیں خالی ہو گئیں ☆ اس قدر سودا خرید ایک دن
- ۱۰۔ جان کر مجھ کو کوئی رڈی کتاب ☆ اس نے الماری میں پھینکا ایک دن
- ۱۱۔ سفیر دن کے روانہ زمیں سے ہوتے ہیں ☆ سیاہ رات کا پیکر ہوا میں اڑتا ہے  
 (پہلے مصرع میں کاتب نے ”سفیر“ کو ”سفید“ لکھ دیا تھا۔)
- ۱۲۔ چہروں کے ریگزار سنوارے گئے بہت ☆ زخموں کا لالہ زار نکھرنے سے رہ گیا
- ۱۳۔ میرا وجود شہر میں ضرب المثل تھا ☆ میں کیسے مسئلوں کے جزیرے تک آ گیا
- ۱۴۔ وہ جو ہوائے تیز سے دردوں میں بٹ گیا ☆ اس کا وجود شہر میں کیوں لازوال تھا



- ۱۵۔ میں لوٹے جو لگا دشت سے نگر کی طرف ☆ لگا رہے تھے مجھے سب درخت آوازیں
- ۱۶۔ زرد سورج سروں کے اوپر تھا ☆ لوگ سائے کے نام سے چونکے
- ۱۷۔ سیکڑوں بادل برس کر راہ اپنی الگ گئے ☆ لیکن اس صحرا کی طرح کوئی پیاسا نہ تھا
- ۱۸۔ ڈھونڈ کر سورج کا ٹکڑا ایک لے آئے تھے لوگ ☆ برف جسموں کا گر صبح تک پگھلا نہ تھا
- ۱۹۔ سبھی درختوں سے پیچھی سہم سہم کے اڑے ☆ وہ اک سکوت جو ٹوٹا مری نجات کے بعد
- ۲۰۔ مرے عہد کی گرم دوپہر میں ☆ بدن منتروں کے نچوڑے گئے
- ۲۱۔ جو لوگ زندگی میں تھے چٹان کی طرح ☆ ٹوٹے تو شاہ راہ کے پتھر بنے کئی
- ۲۲۔ تمام شہر خلاؤں میں جانے والا ہے ☆ اس ایک شخص کو یہ راز کیوں بتایا گیا
- ۲۳۔ گاؤں بھر میں جو بخیلی کے لیے تھا مشہور ☆ شہر میں اس کی عنایات کا شہرہ پاتے
- ۲۴۔ گم شدہ موسم کی یادیں دل میں رکھنا ہے فضول ☆ بھاگتے لمحوں کی تلی بات آتی ہی نہیں
- ۲۵۔ چھاؤں میں ان کی حادثے ہوتے ہیں روز و شب ☆ کتنی ہی وارداتوں کے ہیں راز داں درخت
- ۲۶۔ کشادہ راہ سے میری گلی کا منہ لگا بھی دو ☆ وصالوں کا مزہ تھوڑا سہی اس کو چکھا بھی دو
- ۲۷۔ ہماری آنکھ کے آنسو نہ پی جائے کہیں سورج ☆ بہت دن ہو چکے ہیں اب صف ماتم بچھا بھی دو
- ۲۸۔ بس گئے شہر حقیقت میں وہ جن کے دل نہیں ☆ اہل دل تو اب بھی خوابوں کے مضافاتوں میں ہیں
- ۲۹۔ کراہی شے کی طلب جس کو پاسکے اسعد ☆ دعا وہ مانگ جو صحراؤں کی ازاں بھی نہ ہو
- ۳۰۔ ہوا اڑا کے نہ لے جائے کوئی سی پارہ ☆ ورق ورق مرے خوابوں کی داستاں رکھنا

☆☆☆

## بنام ہمشیرہ (بیگم خواجہ احتشام الدین قادری)

ہوا مقتدر

غزال! سلامتی، رحمت اور برکات

اس عرصہ میں کافی شعر کہتا رہا، کچھ فارسی عربی اشعار تو محترمہ حظ صاحبہ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ اسے اتفاق ہی کہو کہ برسوں میں ایک غزل بھی ہو گئی، ان دس برسوں میں یہ دوسری غلطی ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک جگہ رباعی کا طرجی مشاعرہ تھا، رباعیاں نعت میں کہنی تھیں۔ حکیم محمود الرحمن صاحب کی صدارت تھی، ان کے خاندان سے مدرسہ قادریہ کے اکابر کے بڑے خاص تعلقات تھے، میں ان کا احترام کرتا ہوں، وہ بھی بے حد کرم کرتے ہیں۔ اتفاق سے اورنگ آباد سے یعقوب بھائی آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس گیا انھوں نے فرمایا ”کل مشاعرے میں آ رہے ہو؟ اچھا تم اور یعقوب دونوں میرے پاس آ جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔“ مجبوراً رات میں رباعیاں کہنی پڑیں اور ان کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی۔

جب میں پڑھ کر تخت سے اتر اتو یعقوب بھائی نے یہ داد دی، ”او استاذ! اب تو بوڑھا ہو گیا، پینترے بازی پر اتر آیا اچھا ہوا غزل چھوڑ دی، اب استاذی دکھایا کر۔“

دوسرے روز غزل کہہ ڈالی اور یعقوب بھائی کو سنادی، خوش ہوئے۔  
ہاں تو وہ غزل تمہیں سنا دوں تو کیا مضائقہ ہے تم باجی جان کو سنا دینا، ممکن ہے کہیں اصلاح کی ضرورت ہو۔

دل میں ہر جلوہ صد رنگ سمو لو دیکھو      میری دنیا میں مگر آنکھ نہ کھولو دیکھو  
سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۱۹۷۰/۷/۱۴ء

ہوالمقتدر

عزیز غزالہ و احتشام بارک اللہ لکم سلامتی، رحمت اور برکات

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ زندہ ہوں اور کیا چاہیے۔

ہائے اردو مرحوم۔ تم جو نہیں چاہتی ہو وہ لکھتی ہو مگر اردو اب ہے کہاں؟ میری بھابی اماں نے دودھ کے ساتھ گھٹی میں پلائی تھی۔ اردو میں ”خبر“ اور ”اطلاع“ دونوں کے معنی میں فرق ہے، تم میری خبر چاہتی ہو تو وہ وقت آنے کے بعد دوسرے دیں گے، اطلاع چاہو تو معلوم کرو ابھی زندہ ہوں اور نہ جانے یہ سلسلہ کتنا لمبا ہو۔ لیٹا ہوا ہوں، سر اٹھاتے ہی چکر آتے ہیں۔

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۹/۶/۱۰ء

## بنام حافظ سید عبدالمولیٰ قادری بریلوی

ہوا مقتدر

۳ شوال ۱۴۳۹ھ

مدرسہ قادریہ بدایوں

مولا بخش صاحب! تسلیم نیاز

ہم ہی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی  
در دولت پر حاضری دی مگر بے کار، وہاں بھی نگہ ناکامیاب، معلوم ہوا کہ ”صاحب واک  
کرنے کے لیے اسٹیشن گیا ہوا ہے“۔ سخت غصہ آیا اور صرف لفظ چغدر پر اکتفا کیا۔  
چھتیس گھنٹہ ہو چکے ہیں کہ جناب کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا۔  
فرض کردم کہ بیاد تو دلم خر سند است  
لیکن ایں دیدہ دیدار طلب راچہ علاج  
آخر اس وقت تک مدرسہ تشریف آوری کیوں نہیں ہوئی، جلد آؤ سخت انتظار ہے، فوراً  
تشریف لائیے بعد از عنایات نہ ہوگا۔ کیا میں آپ کا انتظار کروں؟

والسلام

محمد عبدالبہادی القادری

مدرسہ قادریہ بدایوں

ہوا مقتدر

محمد عبدالبہادی القادری بدایونی

متعلم فاضل

مدرسہ محمدیہ امدادیہ، بہادر گنج الہ آباد

ڈیر مولا بخش! السلام علیکم

تم سے رخصت ہو کر بخیریت الہ آباد پہنچا، آتے ہی ارادہ تھا کہ تم کو خط لکھوں اور تمہاری

مطلوبہ چیز تم کو بھیج دوں مگر طبیعت کچھ اس قدر کسمندر رہی کہ مکان بھی خط نہ لکھ سکا۔ امید ہے کہ کچھ خیال نہ کرو گے کیونکہ اس دیر حاضری خط میں کچھ نقصان بھی نہیں ہوا۔ یہ خط تم کو نوچندی جمعرات سے پہلے مل جائے گا اور تم وظیفہ پڑھ سکو گے۔

مولا بخش ہمارے لیے بھی دعا کرنا اور اس معاملہ خاص میں دعا ضرور کرنا جس کا ذکر تم سے کر چکا ہوں۔ اگر خدا کو منظور ہے تو اس کے بعد بہت سی باتیں ہوں گی۔

میں وہ عمل تم کو تحریر کرتا ہوں جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، تم کو اس کے پڑھنے کی اجازت ہے دوسروں کو بھی بتا سکتے ہو اور اجازت بھی دے سکتے ہو۔

حافظ صاحب سے سلام عرض کر دینا، نور سے بھی سلام کہہ دینا۔ اور اپنی زوجہ محترمہ سے بھی سلام کہہ دینا بچی کو دعا، خدا کرے کہ تھوڑے دنوں بعد بچے کو بھی دعا لکھی جاسکے آمین۔

اور کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں، خیریت سے مطلع کرنا  
والسلام تمہارا مخلص بھائی

عبدالہادی القادری بدایونی

## بنام مولانا سید معین الدین قادری جیلانی سلطان پور

ہوا مقتدر

معین بھائی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً تمہیں میرے خط کا انتظار ہوگا اور مجھے درگاہ قادری میں تمہارے خط سے زیادہ تمہارا انتظار رہا، مگر معلوم نہیں تمہارے یہاں کی چھٹی اور تعطیل سے استفادہ اور الحاق کے کیا اصول ہیں؟ اس لیے تم نہ پہنچ سکے تو اس کی وجہ ہی رہی ہوگی۔

میں ۵ شوال پنشن بنہ کو بعد مغرب بدایوں پہنچا، درگاہ قادری میں پہلی حاضری ۶ کو بعد فجر مدرسہ قادریہ کے معمولات کے مطابق ہوئی، جمعہ کو صبح سب درگاہ میں حاضر ہو کر قرآن کا ختم کیا کرتے ہیں۔

ابھی عرس قادری شروع ہونے میں دو دن ہیں، ان دنوں میں کچھ خانہ پری کرنی ہے پر دیسی سال بھر بعد آتا بھی ہے تو زائر کی حیثیت سے، اب جو دو دن پہلے پہنچا ہے تو تعزیتیں کر لیں۔ موسم خوب سرد بلکہ تھ ہے، جی ڈر رہا ہے کہ درگاہ قادری میں چار راتیں پانچ دن کیسے گزریں گے مگر کچھ تو آسائش کے انتظامات کی فراوانی اور کچھ تصرفات روحانی کچھ بھی تو محسوس نہ ہوا۔ تفصیلی کیفیات عرس قادری لکھنی شروع کر دوں تو تمہیں کافی انتظار کھینچنا پڑے گا جبکہ اب بھی تم یہی سمجھ رہے ہو کہ انتظار بہت طویل ہو گیا اور ممکن ہے خط لکھ رہے ہو۔ مناقب جس ترتیب سے پیش کیے ہیں اسی ترتیب سے بھیجتا ہوں، کیف لواور حسب معمول اپنے تاثرات لکھ بھیجو۔

ابھی ایک جملہ معترضہ یاد آ گیا پھر بھول جاؤں گا اس لیے کیف میں غرق ہونے سے پہلے ہی وہ سن لو۔

اس سال عرس قادری میں اڑیسہ کے جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب نے بھی شرکت کی جنہیں ان کی جماعت مجاہد ملت کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ بڑی دلچسپ ملاقاتیں رہیں۔ حضرت شیخ دامت برکاتہم نے ان کی پذیرائی اپنی مہمان نوازی کی شان سے کی۔ میرا تاثر بھی ان کے بارے میں بہت اچھا رہا، اس جماعت میں یہ کیسے فٹ ہیں تعجب ہے۔

آدمی سوز و گداز کے اور مرنجاں مرنج محسوس ہوئے۔

پھر بھی میں نے اپنے رنگ سے ان سے گفتگو کر ہی ڈالی۔ اختلافی مسئلہ کا ذکر آیا تو حضرت شیخ دامت برکاتہم نے فرمایا میں نے کوئی لڑائی شروع نہیں کی اور نہ بات بڑھانا چاہتا ہوں۔

میں نے مجاہد ملت سے عرض کیا ”مولانا کیا کروں حضرت شیخ کے احکام نے قید کر رکھا ہے ورنہ یہ (جیب سے قلم نکال کر دکھاتے ہوئے) دیکھ رہے ہیں، کیا ہے؟ دیکھئے یہ قلم ہے اور یقین جانئے اس کی سیاہی خشک نہیں ہوئی ہے۔ ایک بات اور واضح کر دوں میں ہر قسم کی تحریر پر قدرت رکھتا ہوں۔ اگر علمی باتیں یہ حضرات نہیں سمجھ سکتے تو گالیاں بھی میں ان سے زیادہ اچھی لکھ سکتا ہوں، آخر ادب کا طالب علم جو ٹھہرا۔

حضرت شیخ دامت برکاتہم نے فضا بدل دی اور فرمائش کی کہ ”بھائی جان مولانا کو اپنا عربی قصیدہ سنائیے۔“ میں نے کہا مولانا حضرت شیخ دامت برکاتہم بغداد پاک تشریف لے گئے تو بمبئی سے تحریر فرمایا ”بغداد میں تمہارا خط ملنا چاہیے“ گویا نذر طلب فرمائی فوراً ایک سہ آتشہ نذر کیا، اچھا سنیے فارسی، عربی اور اردو کا یہ سہ آتشہ۔“

غرض کہ کافی تفریح رہی، آخر میں رخصت ہوتے ہوئے وہ اپنا پیپہ نوٹ کرا گئے کہ میں سہ آتشہ اور ابھی درگاہ قادری میں جو عربی قصیدہ پیش کیا ہے اس کی نقل بھی انھیں بھیج دوں اور سند حدیث کی نقل بھی مانگی اور بتایا کہ ”میں نے (مجاہد ملت نے) حضرت اقدس (عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی) سے ان کی حدیث کی سند بطور خاص حاصل کی ہے کیونکہ وہ کسی دوسری جگہ نہیں، اس کی نقل چاہیے۔“ اشعار بھیج دیے، سند تلاش کروں گا۔

الحمد للہ معمولات پورے ہوئے۔ زندگی رہے تو اگلے سال پھر یہی کیف و مستی ہوگی، انشاء اللہ۔

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

مدرسہ قادریہ بدایوں

بنام اسید الحق محمد عاصم قادری

برادر عزیز شیخ عاصم القادری حفظہ اللہ وبارک لکم ..... سلامتی، رحمت اور برکات  
ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ امید کہ تم اور سب خیریت سے ہو گے۔ یہ گدائے خاک نشین محمد  
قادری ایک کام میں لگا ہے دعا کی جائے جلد سے جلد مکمل ہو، آمین  
اس سلسلہ میں آپ کی اجازت کی ضرورت ہے کہ میں جو کتاب شائع کروں اس کا ملنے کا پتہ  
”شیخ عاصم قادری، مدرسہ قادریہ مولوی ٹولہ، بدایوں“ بھی لکھوں۔  
کتاب کا نام ”احوال و مقامات“ ہوگا۔

قلم کار۔ محمد قادری گدائے خاک نشین، طالب علم مدرسہ قادریہ سامنے کے صفحہ پر ہی لکھا ہوگا۔  
کبھی کبھی خیریت لکھ دیا کرو۔ سب پر سلامتی اور بس، والسلام  
گدائے خاک نشین

محمد قادری

۱۳/۷/۹۱ء



برادر عزیز شیخ عاصم القادری بارک اللہ لکم زید مجدکم سلامتی رحمت اور برکات  
ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ امید کہ تم اور سب بخیر ہوں گے۔ میری طبیعت خراب تھی، پونے  
سے حضرت شیخ نے مجھے حیدرآباد بھیج دیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں اور دولت آباد جانے کے لیے  
ریزرویشن کر لیا ہے، اپنے بڑے پیر کے دروازہ میں لوٹ لگاؤں تو مستی چھا جاتی ہے۔  
مسجد خرم میں قرآن تو تم نے ہی سنایا ہوگا؟ یہ تو تمہارا ہی حق ہے، اللہ برکات دے، آمین۔  
سنائے تم نے عربی درسیات شروع کر دی ہے، اللہ تمہیں ہر طرح اپنے اسلاف کا جانشین بنائے۔  
احوال و مقامات کی کسی نے رسید بھی نہیں دی، خط تو لکھنا ہی چاہیے تھا، میں جو لکھ سکتا تھا وہ  
میں نے لکھا جسے پسند نہ آئے وہ خود ہی قلم چلائے اور مجھے مطلع کرے۔

گدائے خاک نشین

سب پر سلامتی اور بس

محمد قادری

۱۷/۳/۱۹۹۲ء



فغان ہادی



## تشطیر الخمریة

”سقانی الحب کاسات الوصال“	حمدت الله ربی ذالجلال
”لقد اعطانی من شرب حلال“	”فقلت لخمرتی نحوی تعالی“
”سعت و مشت لنحوی فی کوؤس“	لنعم الخمر ا حلی من زلال
باسم الواهب المنعم شربت	”فهمت لسکرتی بین الموالی“
”فقلت لسائر الاقطاب لموا“	اذا انتم رجوتکم بالکمال
”فمیلوا بالقلوب الی جمعا“	”بحالی وادخلوا انتم رجالی“
”وهموا واشربوا انتم جنودی“	سعيد الذی يعمل فعالی
خذوا کاسی وکاسا بعد کاس	”فساقی القوم بالوافی ملالی“
”شربتم فضلتي من بعد سکری“	تلالت الجباه من الجمال
سماء الفضل من فضلی صعدتم	”ولا نلتم علوی واتصالی“
”مقامکم العلی جمعا ولكن“	علوی ذروة القصر الکمالی
على الارض جبال فالسماء	”مقامی فوقکم مازال عالی“
”انا فی حضرة التقريب وحدي“	وقربنی حبیبی بالوصال
انا من کل نفسی طوع امره	”یصرفنی وحسبی ذوالجلال“
”انا البازی اشهب کل شیخ“	اذا ما اغتدی اعلی الجبال
لکل مفخر فی الخلق لکن	”ومن ذا فی الرجال اعطی مثالی“
”کسانی خلعة بطراز عزم“	بديع الخلق ربی ذوالجلال
فدت نفسی علی لطف حبیبی	”وتوجنی بتيجان الکمالی“

☆ عربی شاعری میں ایک صنف ”تشطیر“ کہلاتی ہے، جس میں شاعر کسی دوسرے شاعر کے قصیدے کے ہر مصرع پر مصرع لگاتا ہے، مندرجہ بالا قصیدہ حضرت غوث پاک کے مشہور قصیدے ”قصیدہ ثمریہ“ کی تشطیر ہے (اسید الحق)

”واطلعنى على سر قديم“  
 فاكرمنى بانعام جزيل  
 ”وولانى على الاقطاب جمعا“  
 عطانى سلطة فوق الجميع  
 ”فلوالقيت سرى فى بحار“  
 هدى الطغيان من تاثير امرى  
 ”ولو القيت سرى فى جبال“  
 الم يصعب عليها حمل سرى  
 ”ولو القيت سرى فوق نار“  
 وعشقي قد ورثت من خليل  
 ”ولو القيت سرى فوق ميت“  
 فلبانى ندائى طوع امرى  
 ”وما منها شهور اودهور“  
 وليست ساعة جاءت بشيء  
 ”وتخبرنى بما ياتى وتجرى“  
 انا السلطان ايام عبيدى  
 ”مريدى هم وطب واشطح وغن“  
 اتاك الهم فانزل فى حماى  
 ”مريدى لا تخف الله ربي“  
 حبيى اسبغ النعمة على  
 ”مريدى لا تخف واش فانى“  
 لتشهد اننى عذب رقيق

از ال السترعن وجه الجمالى  
 ”وقلدى واعطانى سوالى“  
 ادير فى الجنوب وفى الشمال  
 ”فحكمى نافذ فى كل حالى“  
 بامواج تموج كالجبال  
 ”لصار الكل غوراً فى الزوال“  
 كبار شامخات والعوالى  
 ”لدكت واختفت بين الرمال“  
 واظهرت بنور قد بدالى  
 ”لخدمت وانطفت من سر حالى“  
 رميم فى تراب القبر بال  
 ”لقام بقدرة المولى تعالى“  
 من ايام منيره ام ليالى  
 ”تمرو تنقضى الا اتالى“  
 به الايام حالا بعد حال  
 ”تعلمتى فا قصر عن جدالى“  
 وجرع خمر كاسات الوصال  
 ”وافعل ما تشا فالاسم عالى“  
 جواد ذوالعطاء والنوال  
 ”عطانى رفعة نلت المنالى“  
 الب مستمدا فى النزال  
 ”عزوم قاتل عند القتال“

”طبولی فی السماء والارض دقت“  
 بهٰذا أنعم اللّٰه علیّ  
 ”بلاد اللّٰه ملکی تحت حکمی“  
 فلحت حین زکائی الہی  
 ”نظرت الی بلاد اللّٰه جمعا“  
 فعاینّت صغیرا او کبیرا  
 ”وکل ولی له قدم وانی“  
 اطیع امر ربی قد اسیر  
 ”درست العلم حتی صرت قطبا“  
 ولا تسعد بدون الشیخ فانظر  
 ”رجالی فی هو اجرهم صیام“  
 یضیء قلبهم من نور ربی  
 ”انا الحسنی والمخدع مقامی“  
 حبیبی خصّنی فوق الجمیع  
 ”انا الجلیلی محی الدین اسمی“  
 لقد سرا لبلاد بالسلامہ  
 ”وعبد القادر المشہور اسمی“  
 لقہری بینہن والجلال  
 ”وشاوؤس السعادة قد بدالی“  
 کما شئت اذیر لا ابالی  
 ”ووقتی قبل قلبی قد صفالی“  
 جعلت حینما فی الملک والی  
 ”کخر دلة علی حکم اتصالی“  
 ورثت من حبیب اللّٰه حالی  
 ”علی قدم النبی بدر الکمال“  
 بجهت ترتری درج الکمال  
 ”ونلت السعد من مولی الموالی“  
 ویقتاتون من عذب زلال  
 ”وفی ظلم اللیالی کالآلی“  
 ولیس فیکم دراک حالی  
 ”واقدامی علی عنق الرجال“  
 سفیت الدین من داء عضال  
 ”واعلامی علی راس الجبال“  
 بامر من قدیر ذی الجلال

فسل یا عبدی الہادی لتعطی

”وجدی صاحب العین الکمال“



## على نهج عمرو

أُمى لا تظنى ان ادين  
ولدت ثم فى اذنى عمى  
وما فارقنا حضنك فى الرضاعة  
لك الشكر الجزيل على حينك  
حرمتك فجأة بعد الفطام  
لرب فاطر المخلوق فاسجد  
اذا يخذعك ذونور فقل له  
بطرفٍ من عصا القهار فاضرب  
وكبر انما الله اكبر  
وادع قومك مادمت حيّاً  
واما النفس والشيطان خالف  
الا تعلم بكل الارض ماذا  
اعاجم والعرب فيها سواء  
فماء صافياً يشرب غنى  
يميتون البنات خوف عار  
الا تسمع يقولون جهارا  
لقد منّ اله العالمين  
على الامى والافصح لسانا  
بصدق الوعد قد امتاز فى الكل  
لحبلٍ من مسد فى الجيد تبت

بسلطان العداء الظالمين  
لا لقي باسم رب العالمين  
بشدى من سواك لما رضينا  
فمنذ البدء لسنا مشركينا  
فخلذى ابى علما و دينا  
امام الغير لا تخضع جينا  
بأنى لا احب الأفلين  
ولا يفزعك كيد الساحرين  
اذا ما خار عجل السامرين  
الى الخالق اله العالمين  
ولا تترك سبيل المرسلين  
جرى فى فترة من مندرين  
ترى هم فى هوى هم غارقين  
ويسقى غيره لدرا وطننا  
ويبقون حماتهم البنين  
وجهل فوق جهل الجاهلين  
بتنزيل هدى للمتقين  
فلم يقرء وفاق القارئين  
وقبل البعثة يدعى امينا  
بامر الله ايدى الساخرين

واعلن انما الاسلام سلم  
بقلب واللسان واليدين  
فلا فخر لكم الا بتقوى  
اشد خصومة لكم عنيد  
واشرار ليزدادون بغيا  
بعيش الخلد في الجنة نفوسا  
ليسف من سيوف الله غرب  
فجاهد في سبيل الله يظهر  
فمن خيرا لانام خير هدى  
فصل ثم سلم يا الهى  
واهل بيته الاطهار جمعا  
واله كلهم وصحب  
لقد حمد الحياة بدون جهد  
تركنا السنة فخذلنا جمعا  
لنا استغفر الله لجئنا

بجبل الحق اكل الماسكين  
بعون الله صيروا مسلمينا  
وربى قد يحب المتقين  
حذار من يهود المفسدين  
لو عاملت بهم رفقا ولينا  
فان الله اشترى من مومنين  
بلطف الله قد مازال فينا  
من القران فضل مجاهدين  
حفظنا نعم ذخرا لداخرين  
على المدعو بختم المرسلين  
خصوصا امهات المومنين  
كرام اجمعين وتابعين  
ولكن اننا نصباً لقينا  
والقينا بايدى الظالمين  
اليك يا نبى مستغفرين  
(١٢ / ٩ / ١م)





هذه قصيدة انشدتها بمناسبة افتتاح اللجنة العربية التي اسست حالا لتدريب الذين يريدون ان يتحلوا بالآداب العربية ويحسنوا لتكلم باللغة العربية- اذكر فيها غابر العريان وحاضرهم وارجلهم الفوز الكبير في المستقبل بعون الله وهو ولي التوفيق- اللهم زدهم مفخرة ووقفهم منع حماهم لتجدد لهم المجد الخالد، آمين-

اهدى هذه القصيدة الى:

### بنى العروبة

حَامِلُوا الْمَجْدِ نَاطِقُونَ بِضَادٍ	قَدْ وَرَثْتُمْ كَرَامَةَ الْأَجْدَادِ
فِي الْفَلَا حِينَمَا الْخُمُورُ شَرِبْتُمْ	أَطْرَبْتَكُمْ طُيُورُ بِالْأَعْرَادِ
تَخْبَلُونَ مِنَ الْعُيُونِ وَلَكِنْ	لَانْظِيرَ لَجِيدَ ظِيَّةٍ وَادِي
أَنْتُمْ ابْنَاءُ غَيْرَةٍ وَشَهَامَةٍ	خُضْتُمْ كَمْ مَعَارِكٍ لِسَعَادِ
فَخَرُّكُمْ هَذَا لَيْسَ فِيهِ شَرِيكَ	أُنْزِلَ الْقُرْآنُ خَيْرُ رَشَادِ
نَسَدْتُمْ الْأَرْضَ كُلَّهَا وَحَكَمْتُمْ	مِنْ دِمَشْقِ الشَّامِ وَمِنْ بَغْدَادِ
إِنْكُمْ مِنْ صَوَارِمِ بَيْضَاءِ	قَدْ مَحَوْتُمْ ظِلَامَ كَيْدِ أَعَادِ
سَجَّلَ فِي صَحِيفَةِ التَّارِيخِ	بَعْدَ حَرْقِ السَّفِينَةِ ابْنَ زِيَادِ
فِي حُدُودِ بِلَادِ كَمْ بِسَلَامَةٍ	أَعْلَنَ كُلَّ رَائِحٍ وَالْعَادِي
خُصَّكُمْ رَبُّكُمْ بِسَمَاحَةٍ	كَمْ عَلَى الْمَجْتَمَعِ لَكُمْ بَايَادِي
أُبْتُلِيتُمْ بِزَحْمَةٍ فَسَكْرْتُمْ	وَحَلَا كَيْسَكُمْ حَسَنُ زَادِ
إِسْتَغَاثَ الْمَلَأَعْنَةَ فَنَصَرْتُمْ	وَأَعْلَنَ بِالْفُورِ الْإِفْسَادِ
أَنْظَرُوا وَأَنْظَرَةَ شَبَابِ عَرُوبِهِ	مَاذَا صَهِيُونُ فَاعِلٌ بِعِنَادِ
صَارَتْ الْأَرْضُ مِنْ قَنَابِلِ نَارًا	وَأَصْبَغَتْ مِنْ دَمٍ تَلُولِ رِمَادِ
سُلْطَةُ الظَّالِمِينَ فَوْقَ النَّبِيلِ	أَوْجَبَ الشَّرَامَ الْهَلَاكِ لِرَادِ
لَا تَظُنُّوْا أَنَّهُ لَوْحِيدٌ	إِنَّ أَعْمَامَهُ مِنَ الْأَرْصَادِ

نَكْسُوا ذَا بَسَاطِ نَكْسِنُ ثُمَّ	إِصْلَبُوا ذَا اللَّعِينِ بِالْأَوْتَادِ
أَيْنَ أَنْتُمْ بَنَوِ الْعُرُوبَةَ جَبَبُوا	يَا شَبَابَ الْحَيَاةِ قُدْسُ تَنَادَى
أَنْظُرُوا إِنَّ طَائِرَاتٍ تَطِيرُ	فِرْقَةُ الصَّاعِقَةِ لِبِالْمِرْصَادِ
أَتْرَكُوا الْكَسَلَ اخْوَتِي فَسَوَاكُمْ	لَيْسَ عَنْ حَوْضِكُمْ مِنَ الزَّوَادِ
طَلَقَةً ثُمَّ طَلَقَةً كَرَجَالٍ	اسْلُبُوا عَنْ عَدُوِّكُمْ بِسَوَادِ
لَيْتَ شَعْرَى هَلْ الْحَيَاةُ تَجْمَلُ	مَنْ جَمَالَ الْحَيَاةُ فَتَحْ مَرَادِ
إِعْلَمُوا أَنَّهُ يَنَاضِلُ عَنْكُمْ	بِالْقَلَمِ يَعْدِلُ الْمُهْنَدُ، هَادِي

جَدِّدُوا مِنْ سُيُوفِكُمْ بَعْلَاكُمْ

حَامِلُوا الْمَجْدَ نَاطِقُونَ بِضَادِ







بائس انى غريب سائل نحوك اسير      خذيدى وانصر بجودك عندك الخير الكثير  
حينما نادى نادى ان فصل العرس حان      كلنا يطرب ويرقص قلبنا شوقاً يطير  
بعد عام قد مضيت فى هيام جئت بابك      انك غوث غياث جودك الغيث المطير  
منك لمعان ونور فى قلوب العاشقين      يا سراج السالكين وجهك البدر المنير  
دائماً يكفل عبيداً سيّد من فضل جوده      لا ابالى ان عجزت انما انت القدير  
كلما افجع بصعب عند ايوانك اناجى      كيفما كان العسير للغنى امر يسير  
حبذا شجعتنى من "قاتل عند القتال"      انك سيفى ور محى حين عادانى الشرير  
ان قلبى لا يبالى بالحلول الحادثات      يا حبيبى يا مجيبى انت لى نعم النصير  
صاحب الجود العميم منك فضل فوق فضل      كيف استوفى المديح انما شعرى قصير  
سيدى سالم و شيوخى دام مجداً والكرامه      يفرح الرائي اليه وجهه الورد النصير

التفت وانصر ونج يا انيس البائسين

فى هموم والمصائب عبدك الهادى اسير





يا صاحب الجود والاحسان والكرم      من لى سواك لا شكو شدة الالم  
قد كنت تكرر منى فوق الجميع لذا      الدهر صبرنى لحماً على وضم  
لا ذنب لى غير ودد لا افارقه      هل هذا امر به قد يستحل دمي  
لا كذب فى ان خيراً ما عملت به      والنفس عارية من احسن الشيم  
ناديتنى وانا فى حضن والدتى      والقوم يعرفنى من ذلك العلم  
”فان لى ذمة منه بتسميتى محمداً وهوا وفى الخلق بالذمم“

يا رب صل على من لا نظير له      فى الخلق وهو رسول سيد الامم  
سلم وصل عليه دائماً ابداً      والال والصحب من عرب ومن عجم  
وارض عن التابعين كلهم وعن الـ      غوث المعظم وهو صاحب القدم  
غوثى اغثنى بجاه العاشقين فهم      قاموا على بابك العالى من القدم  
بارك لشيخى تراث الاقدمين فهب      واجعله بدرأ منيراً دافع الظلم

ذا الهادى البائس العالى يناجيك

يا غوث نج من الاحزان والالم





انت الفريد بحسبك وجمالک      حارت عقول العارفين بحالک  
ایاک لقبتم المحی وانما      احييت دين الحق من اعمالک  
لزم الخضوع على الجميع براسهم      من عند رب الخلق فى اجلالک  
تغشى المريدين بذیل من عبا      یا غوث فى الدارين من افضالک  
اعطيت خيراً من ملیک قادر      تكفى الانام كسيرة بنوالک  
شجعتنى انت العزوم وقاتل      من لى يخوفنى وبعد مقالک  
اذ قلت ”لیلۃ فى العراق مریضة“      ایاک اعنى یا حبيب بذالک  
الى نشدتک بالفقير وجاهه      انعم علىّ رحمة من نوالک  
یا تیک من من عاسقٍ يتوسل      حظ له فى جاهک وبمالک  
اکرمتم آباى الکرام بسقیهم      یا لیتنى سقیا بكاس وصالک

یا هادی المسکین هل لک حاجة  
یا تیک فضل دائم بسوالک

۱۰ / ۱۱ / ۸۷ھ

۱۰ / ۲ / ۶۸م





هَذَا بَيْتُ اللَّهِ بِالْوَادِي الْأَمِينِ  
انْمَا هَذَا لِبَيْتٍ أَوَّلٍ  
وَادْخُلُوا بَيْتاً لِابْرَاهِيمَ وَابْنِهِ  
طُوفُوا بِالْبَيْتِ الْمُبَارَكِ وَانْحَرُوا  
إِيَّهَا الْحُجَّاجُ فَزْتَمِ بِالْمَنَى  
عِنْدَ مَا نَاجَيْتُمُ الرَّبَّ الرَّحِيمَ  
وَارْحَلُوا مِنْ بَعْدِ مَا حُجَّيْتُمْ  
إِيَّاهُمْ جَاءُوا إِلَيْهِ رَاجِعِينَ  
وَالضُّحَى هَذَا النَّبِيُّ لَا يَنْهَرُ  
فِي الْبَلَدِ مَا زَالَ مَجْدٌ مَدْحَرُ  
فَاسْأَلُوا بِدِرٍّ وَإِيضاً خَيْبَرًا  
أَنْتُمْ أَبْنَاءُ دِينٍ فَاجْمَعُوا  
اعْلَمُوا مَا دَمْتُمْ فِي حَزْبِهِ  
فِي كِتَابِ اللَّهِ قَدْ أُبْشِرْتُمْ  
لَا نَسِيْتُمْ بِالْدُّعَاءِ هَادِيًا  
صَانَكُمْ رَبِّي وَدَمْتُمْ سَالِمِينَ

٢٥ / ١١ / ٨٤ هـ

٢٥ / ٢ / ٦٨ م





شيخ خير بالكتاب وما به  
المجتنى من خيره وصوابه  
فخر له فى انه متعلق  
من صاحب العلم الشريف وبابه  
المشرقى من علمنا المتعارف  
والمغربى بحران التقيا به  
فازوا ونالوا بالعلاء ومجدوا  
ان الذين استمسكوا بجناحه  
تدعوا له اوربا جامعة بها  
استلزمت دعوة له بذها به  
قد يشبه الليل البهيم ظلامه  
ما قد اتانا الدهر حين غيابه  
شخصه لشمس العلوم اشعة  
قد اشرفت ارض الدكن باياه  
يعنيك هادى يا عظيم فضيلة  
اكرم به يهدى اليك بما به  
(١٩٤١/٢/٢٨)



## نشيد الشبان

يا نجوم الارض طلاب المرام  
حاملى رايات جهد والقيام  
استمروا سيركم نحو الامام  
اتركوا والله نوما والكسل  
اقبلو نحو المعالى بالعمل  
وابحثوا فى الكون عن اسمى مقام  
لا تبالوا بالمصائب والمحن  
فى سبيل المجد والحق والوطن  
انتم الاعلون يا ابناء الكرام  
مددوا ظل السلامة والامان  
فوق كل الانس من قاص و دان  
فى الانام انكم رسل السلام



## نذر نجم ہمایون مصطفوی

۱۳ ۵ ۹۰

شاہ جیلاں آن جوانِ ہاشمی ست	زیر پائے او ”فراز دلبری“ ست
فتح باب علم شد بر غوثِ ما	سینہ اش گنجینہ فیض علی ست
پا نہادن زبیدش برگر دناں	دلبر و ہم وارثِ حال نبی ست
قرب منزل چیست، خاکِ درگہش	چست عرفاں از مقامش آگہی ست
بر در قصرش دہد بوسہ فلک	ظل رحمت سقف و بنیادش علی ست
تشنگاں مژدہ کہ در میخانہ اش	ساغر وصل و مدام عاشقی ست
رہبرا وابستہ داماں تو	فارغ از اندیشہ ہائے گم رہی ست
سائلاں شاہاں فقیرانت شہا	در جہاں اے شیخ کل شاہنشہی ست
لہ المیہ کہ از روز ازل	در گلویم طوق عشق بندگی ست
نیستم زار و ضعیف و ناتواں	نسبت تو شاہ جیلانم قوی ست
شاعری ایں گدائے بے نوا	پیروی لطف و میخوار و ولی ست

مژدہ باد اے ہادی مدحت سرا  
تابلش بخت ز نجم قادری ست

☆☆☆



دستگیر خستہ حالاں شاہ جیلانم توئی      یک شب تاریک غم من صبح خندانم توئی  
از غمِ دوراں چرا ترسم کہ درانم توئی      نے غلط گفتم کہ درانم توئی جانم توئی  
ہیچومن داری ہزاراں بندگاں بردرگہت      جز تو مولا کیست یکتا شاہ جیلانم توئی  
آں فقیر درگہ والا سپردت کردہ است      چیت از فکر و الم کارم نگہبانم توئی  
من گدائے باب آنم کو غلامِ پیر ہست      اے شہِ بغداد و جیلاں میر میرانم توئی  
طوقِ عشقت در گلویم در ازل انداختند      تا ابد نازش کناں رقصم کہ جانانم توئی  
وائے بختِ نارسائے حسرتِ محروم دید      جلوہ گر در پردہ ہائے چشمِ حیرانم توئی  
من عزوم و قاتل ام بیباک زی فرمودہ یی      پس چہ باک از دشمنان دارم کہ پیکانم توئی  
بخش سالم راز لطف موج از محبوبیت      بیکراں بحرِ نوال وجود جانانم توئی  
بردرت چوں لطف و میخوار و ولی حاضر شدم      بے نواہم خستہ عالم ساز و سامانم توئی

نیست دور از لطف تو شاہا کہ گوئی از کرم  
شاد زی اے ہادی مضطر ثنا خوانم توئی







نسیم کوچہ پیر مغاں و زید امروز  
زفرط شوق فراواں خراب بادہ وصل  
خبر رسید کہ ساقی کشاد میخانہ  
بہ دل و فور طلب ہست چوں فروغ بہار  
بہم شوند بہ میخانہ میکش و ساقی  
چو او زچہرہ زیبائے خود نقاب کشاد  
سراید از لب ہر برگ گل عروس بہار  
زفیض مرحمت ساقی سقانی الحب  
عجب! زلغزش مستانہ ام چو حرف زدم  
فروغ جلوہ زیبائے پیر میخانہ  
نوید کیف بما مے کشاں رسید امروز  
بسوئے میکدہ قادری دوید امروز  
غم جہاں زدلی مے کشاں رمید امروز  
نبیں کہ غنچہ خاطر چو گل دمید امروز  
رسیدہ است ہماں ساعت سعید امروز  
فزون زمستی صہباست لطف دید امروز  
زفرط شوق، ”نگارا خوش آمدید“ امروز  
مے وصال، دل از دیدہ اش چشید امروز  
زلطف، دیدہ پیر مغاں شنید امروز  
بہ مے پرست دہد مستی مزید امروز

مئے کہ دادی بہ میخوار و جوش و لطف و ولی

ہماں بہ ہادی لب تشنہ ات رسید امروز

(۱۹۶۸/۲/۱۳ء)





بندہ چہ ساز د بیاں خواجہ ز سلطانِ تو  
دولتِ دنیا و دیں ہست ہمہ آنِ تو  
ہمت ز روز ازل طوقِ تودر گردنم  
کہ آبا منم بندہ احسانِ تو  
اے بہ جہاں نایبِ رحمتِ عالمِ توئی  
تنگ بمن کے شود وسعتِ دامنِ تو  
تو غنی و من فقیر نیست ز لطفِ بعید  
یا ہم اگر من شہا لقمہ از خوانِ تو  
من کہ گدائے تو ام از درِ دیگر چہ کار  
درد و جہانم بس ست دستِ زرافشانِ تو  
پیرمغاں گفتمہ است ہست ز شاہاں بلند  
در نظر اہل دل رتبہ دیوانِ تو  
بندہ آں عاشق و خاکِ نشین و فقیر  
ہمرہ شیخ آمدہ ہم شدہ مہمانِ تو  
نہست عجب گر ز لطفِ بخشی مرا مہا  
کوست کہ رفتہ تہی کاسہ ز ایوانِ تو  
دارم امید از کرم او بدہد جنتم  
کے شود از توجہا بستہ دامنِ تو

از نگہ دل نواز خندہ و رقصال شود  
ہادی افسردہ دل رعدِ غزل خوانِ تو

(۱۹۶۱ء)



## سراپا

در خوبی و در حسن آفتابے      عالی مقامے والا جنابے  
تفسیرِ طوبیٰ آں قدِ بالا      زلفِ دراز از رحمتِ سحابے  
ابرو ہلالِ عیدِ تمنا      روشن چینیش چوں ماہتابے  
از چشمِ مستِ خواجہ چہ گویم      در کیف و مستی جامِ شرابے  
بگر بہارِ رخسارِ بگر      رنگیں شگفتہ خنداں گلابے  
گفتارِ شیریں جاں بخشِ دلہا      چوں کشتِ زندہ گردد ز آبے  
دستے کہ بروے دستِ خدا ہست      خلقے ازاں خواہد فتحِ بابے  
تاثیرِ پائے پر نور وے ہیں      ہر ذرہ خاک ست آفتابے  
گفتا کہ ہستی گفتم خرابت      گفتا چہ خواہی گفتم شرابے

آمدِ حضورتِ ہادیٰ مضطر  
با چشمِ گریاں حالِ خرابے

(۱۹۶۱ء)

☆☆☆



بشنِ نوروزِ گل و قل کا مہینہ آیا      جوش پر رنگِ بہارِ خم و مینا آیا  
ہاتھ اس رند کے مستی کا خزانہ آیا      مست ساقی کی نظر سے جسے پینا آیا  
لو مبارک درِ میخانہ کھلا میخوارو      رفعتِ کوثر و تسنیم کا زینہ آیا  
غرقِ مے کر دیں غمِ دہر کو آؤ یارو      پیرِ میخانہ لیے ساغر و مینا آیا  
رنجِ دنیا نے ہمیں مار ہی ڈالا ہوتا      کیفِ صہبائے غمِ عشق سے جینا آیا  
رحمتِ کل کی ہوئی حشر میں آمد آمد      مہرِ محشر کو خجالت سے پسینہ آیا  
نا تمام آرزوئیں بن گئیں دل کی دھڑکن      لذتِ تشنگیِ عشق سے جینا آیا  
تھا ہی کیا پاس بجز داغِ غمِ عشقِ نبی      ان کی نظروں میں یہی ایک نگینہ آیا  
چاندنی چھٹکی ہے ہر سمت دلِ مضطر میں      یاد جس وقت سمن زارِ مدینہ آیا  
پایا میخوار نے جب سلسلہ پیرِ مغاں      کیفِ صہبائے یقینِ سینہ بہ سینہ آیا  
دیکھو کس طرح چڑھاتا ہے غٹا غٹ ساغر      بادہ کش میں اثرِ قلقلِ مینا آیا  
پیرِ میخانہ سلامت رہے اس کے ہاتھوں      دور میں ساغرِ صہبائے مدینہ آیا  
لطف و میخوار و ولی کی ہے کرامت ساقی      مجھ سے نااہل کو شغلِ مئے و مینا آیا

ہادی زار کو دیکھا تو یہ بولے قدسی

اے لو وہ بلبلِ بستانِ مدینہ آیا





کھول دے بندِ نقابِ رخِ زیبا کوئی  
جیب سے بھی نہ نکالے یدِ بیضا کوئی  
طالبِ دید رہا تاحدِ سینا کوئی  
محوِ نظارہ سرِ عرشِ معلیٰ کوئی  
ایسا رکھتا ہی نہیں قربِ خدا کا کوئی  
دل ہے یا محرمِ اسرارِ تجلا کوئی  
پائے مالک سے ہے مازاغ کا تمنغہ کوئی  
جز ترے رکھتا نہیں دیدہٗ مینا کوئی  
بزمِ ہستی میں اجالا ہی اجالا ہوگا  
لے کے آیا ہے چراغِ رخِ زیبا کوئی  
میں یہ سمجھوں کہ ملی میری نظر کو معراج  
دیکھ پاؤں، جو تجھے دیکھنے والا کوئی  
ایسے ”اثنین“ کہ کونین میں لاثانی ہیں  
اُن سا محبوب، نہ صدیق سا شیدا کوئی  
ہے یہی سب کو بلانے کا سبب محشر میں  
دیکھیں سب بخشے جو انعامِ فطرَضیٰ کوئی  
اب اسی در سے ہی مل جائے گا صدقہٗ ہادی  
کام رکتے نہیں دیکھا کبھی تیرا کوئی





پوچھا جو کیف ساقی بزم الست نے  
 لا کو بھی غرق جام کیا مے پرست نے (۱)  
 صورت دکھائی اپنی حبیب الست نے  
 دیکھا نہیں کہیں بھی کسی مے پرست نے  
 ظاہر کی تشنگی نگہ مے پرست نے  
 مرثدہ دیا جو غلد کا رب الست نے  
 نعرہ لگایا پی کے ادھر مے پرست نے  
 حوران غلد بھرنے چلیں ساری نعمتیں  
 کوئی نگاہ جن کا تصور نہ کر سکے  
 میخانہ بہشت کے ایوان گونج اٹھے  
 ساقی نے مٹچوں سے کہا تم پلائے جاؤ  
 چمکائے یوں قلوب کہ احیائے دیں ہوا  
 حاجت بیان کرنے کی حاجت نہیں رہی  
 پابندیوں سے ساری وہ آزاد ہو گیا  
 ہادی خمارِ عشق کا ساغر چھلک اٹھا  
 ایسی پلائی بے خودی چشم مست نے



۱۔ حضرت اقدس نے جب ارشاد فرمایا تھا کہ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو تم سے اس کے متعلق سوال بھی نہیں ہوگا، تھوڑا وقت نکالو میں فصوص پڑھا دوں پھر سمجھ میں آجائے گا۔ میں نالائق تیار نہ ہوا کہ جب مجھ سے سوال نہیں ہوگا تو میں خود کو کیوں پھنساؤں۔ تو ارشاد ہوا ”ٹھیک ہے مگر مسئلہ کا انکار نہ کرنا، مسئلہ حق ہے جو اسے سمجھ سکتے ہیں ان سے سوال بھی ہوگا“، اس لیے یہ شعر کہا، کہ مسئلہ حق ہے تو ”لا“ کا گز نہیں ہو سکتا۔ (ہادی القادری)



جامِ دل ٹوٹ کے قیمت مانگے  
تیری صہبائے محبت مانگے

شوقِ نظارہ قیامت مانگے  
یعنی صبحِ شبِ فرقت مانگے

کس لیے اجرِ عبادت مانگے  
مانگنا ہی ہے تو رحمت مانگے

عرصہٴ حشر میں جس کو دیکھو  
سایہٴ دامنِ رحمت مانگے

اچھے اچھوں نے سیہ کاروں سے  
گوہرِ اشکِ ندامت مانگے

چارہ گر کس لیے فکرِ درماں  
درد ہی درد کی لذت مانگے

تم سے اے خاک نشیں ہادی زار  
تھوڑی خاک درِ دولت مانگے



دل کی پونجی حضور کا غم ہے  
 سائے میں جس کے سارا عالم ہے  
 سب پہ بھاری یہ عشق کا غم ہے  
 ذکر جنت کا عالم عالم ہے  
 ہو اگر مہر حشر برہم ہے  
 جس سے کھل اٹھے پھول دامن میں  
 کیوں نہ دل مستیوں میں رقص کرے  
 عشق نے تازہ زخم بخشے ہیں  
 لو نظر آیا قبۂ خضرا  
 دل میں آتا نظر مدینہ ہے  
 عرصۂ حشر میں ہر اک لب پر  
 صرف صدیق انبیا کے بعد  
 دفع ابلیس کے لیے بے شک  
 کیوں نہ مشہور ہو وہ ذوالنورین  
 عشق کا فیض عالم عالم ہے  
 رحمت عالمیں کا پرچم ہے  
 ورنہ مجھ ناتواں میں کیا دم ہے  
 وہ مدینے کی گلیوں میں ضم ہے  
 ان کے سائے میں ہم ہیں کیا غم ہے  
 اشک خونیں مثال شبنم ہے  
 جلوہ گر اس میں آپ کا غم ہے  
 آج کچھ دردِ زندگی کم ہے  
 آرزوؤں کا اور عالم ہے  
 مفت مشہور ساغر جم ہے  
 یا شفیع الوریٰ ترحم ہے  
 افضل خلق ابنِ آدم ہے  
 نامِ فاروق اسمِ اعظم ہے  
 زوجِ دو ذہتِ شاہ عالم ہے



رشتہ بو تراب و دین میں  
 بدر کے معرکے میں ہر اک سر  
 وارثِ حالِ سرورِ کونین  
 شمسِ دین میں کی کرنوں سے  
 مستِ ساقی نے بخشا ساغرِ وصل  
 شاہِ جیلاں کے آستان کے فقیر  
 ہے جو غوثِ الوریٰ کا خاک نشین  
 رنجِ دنیا سے چھین لے ہتھیار  
 شیخِ سالم کے ہاتھ سے ساغر  
 لطف و میخوار و بیکل و منظور  
 عہدِ طفلی سے ہی مسلم ہے  
 شیرِ حمزہ کے سامنے خم ہے  
 وہ جو مشہور غوثِ اعظم ہے  
 چہرہ عینِ حق چماچم ہے  
 مستیوں کا عجیب عالم ہے  
 تیری دریا دلی مسلم ہے  
 تیرے ہی در پہ میرا سر خم ہے  
 ان کے عاشق میں ہی یہ دم خم ہے  
 ملتا ہے میکشوں کو کیا غم ہے  
 ان کے نعموں کا خاص عالم ہے

وہ ہمارے ہوں ہے بلند مقام  
 ہادی ہم ان کے ہیں یہ کیا کم ہے

(۱۹۸۵ء/۱۲/۱۱)

☆☆☆

بجعمیل ارشاد شبہ ما

ھ ۱۴۰۴

انفاس غریب

ھ ۱۴۰۴

نغمہ درد محیط

ھ ۱۴۰۴

گدائے خاک نشیں پیشگاہ

ھ ۱۴۰۴

## مطلع اول

گریہ نیم شب واہ سحر بے تاثیر  
کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا مسرت کا نشان  
تیر باراں کیے جاتی ہے زمانے کی ہوا  
دیکھو سیر گل و گلزار تو مقتل کی نوید  
خیمہ زن ہے دل تیرہ میں ہمیشہ شب تار  
زندگی کیسے کہیں اس کو کہ ہر دم ہے یہ ہول  
بس کہ بازار جہاں میں ہے محبت نایاب  
سب سے بڑھ کر تو یہ آفت ہے کہ اب اہل جہاں  
کیسی گردش ہے کہ بنتی نہیں کوئی تدبیر  
ہے زمانے میں تو بس درد و الم کی توفیر  
آہ دلدوز سے ہر ایک کا دل ہے خنجر  
نظر آتی ہے ہر اک خواب کی الٹی تعبیر  
ہائے خورشید کی کرنیں بھی ہیں کیا بے تنویر  
جانے اب کس کا گلا آتا ہے زیرِ شمشیر  
خشمگیں ایسی نگاہیں کہ برستے ہوئے تیر  
اس مصیبت کو سمجھنے لگے اپنی تقدیر

کیوں پریشان ہے کر عرض اسی کے در پر جس نے بخشی ہے تجھے ملکِ سخن کی جاگیر

## مطلع دوم

### مدح حضرت عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی قدس سرہ

وہ غنی ابن غنی سر و گلستانِ فقیر	قبلہ و کعبہ جاں رہبر دیں عبد قدیر
شاہِ بغداد کی الفت کا مرقع وہ ذات	عشق سرکارِ رسالت کی وہ گویا تصویر
وہ تلطف وہ تبسم وہ نظر کیف آگیاں	اس کی ہر ایک ادا دل کے لیے دامن گیر
مجلسِ علم میں صدرِ علمائے اعلام	صفِ احرار میں شامل ہے وہ باندھے شمشیر
تاکہ ہو ملک کے صناعت کو فروغ	پہن لے گاڑھا گزی چھوڑ کر دیا و حریر
مل گئی تھی یہ بشارت تو بہت پہلے ہی	راہِ بغداد میں چلنا ہے اسے بن کے اسیر
غم کو لے جائیں بہا کر متبسم نظریں	موجیں لیتا ہوا دریاے فصاحت تقریر
خمرِ فارض کا جھلکتا ہوا آنکھوں میں خمار	اور وہ جرعه کش بادۂ میناے امیر
وہ ہے وہ تحفہ کہ بغدادِ معلیٰ اُس کو	پیش کرنے کے لیے لے گیا خود اس کا پیر

## مطلع سوم

### مدح سرکار صاحب الاقترار شاہ عبدالمتقدر مطیع الرسول قادری قدس سرہ

عینِ حق کے مہ تابندہ سراپا تنویر	ساقی میکدۂ عشق دل و جانِ فقیر
”مقتدر خاک نشین در غوثِ اعظم“	ذره پر نور ز تابندگی مہرِ منیر
اس کے نظارے میں ہے خیر قروں کا جلوہ	سیرت ختمِ رسل کی وہ مکمل تصویر
منزلِ قرب میں ہر آن ملے وصلِ حبیب	اس نے ہر خواہش دنیا کو کیا بے توقیر
پاسِ انفاس کہ ”انت“ کی صدائیں آئیں	طاعت و زہد میں کہیے اسے آپ اپنی نظیر

اللہ اللہ مرے سرکار کی وہ شان وصال  
مٹ نہیں سکتا کبھی دوری و مہجوری سے  
سجدہ و قرب الہی کی حقیقی تفسیر  
عشق اس کا ہے مرے دل میں کہ پھر کی لکیر  
ہے یقین مجھ کو نہ پہنچے گا کبھی کوئی گزند  
گرتے گرتے جو کہوں ”مقتدر ادم گیر“  
مجھ سے فرمائیں کہ چل اس سے کہیں تیرا حال  
وہ کہ ہے مملکت فقر و غنا کا جو امیر

### مطلع چہارم

#### مدح تاج الفحول محبت رسول شاہ عبدالقادر قادری قدس سرہ

آستانِ شہ بغداد کا مخصوص فقیر  
مظہر و مظہر حق علم و عمل کا پیکر  
فیضیاب اس سے زمانے کے صغیر اور کبیر  
اس کے ہر لفظ میں اک سحر، نظر میں تسخیر  
وہ سبھی جن کو ملا علم سے رتبہ عالی  
حق و باطل میں کوئی شبہ کا امکاں نہ رہے  
چل نہیں پایا روافض کا وہ مکر تفضیل  
کبھی چہرے سے اشد او کی ہیبت کا ظہور  
رد کیا ایسے کہ ہو جائیں مکائد ظاہر  
سعی میں اس کو معیت کا شرف بخشا گیا  
چھوڑ کر جام و سبوا اس کی طرف کو دیکھو  
جس کو ہر ایک سمجھ لے وہ شگفتہ تحریر  
عزت افزائی کرے ایسی وہ سب پیروں کا پیر  
دیکھنا چاہو اگر مست نظر کی تاثیر

### مطلع پنجم

#### مدح سیف اللہ المسلمول سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہ

ساتی بادہ کشاں، مست، مئے حب امیر  
جلوہ بے پردہ دکھائے جسے سب پیروں کا پیر

ہے کبھی ”مظہر محمود“ کبھی ”مظہر حق“  
 زیب سر علم کی دستار ہے خرقة بردوش  
 جب اٹھا غلغلہ فتنہ قرن شیطان  
 فن طب کا ہے کرشمہ کہ تصرف اس کا  
 شاہ بغداد کے الطاف و کرم نے اس کو  
 جس طرف ہو کے گزر جائے وہ گلشن بہ کنار  
 خاک اس کے در اقدس کی جبین پر مل کو  
 چاہیے اس کو کہ دے باب مجیدی پہ صدا  
 رنگ تو عینی معنی ہیں مگر اک تصویر  
 دل ہے دنیا سے نفور، عقل میں ہے فہم وزیر  
 مذہب حق کی حمایت میں مہند شمشیر  
 وہ اگر خاک بھی بخشے تو بنے وہ اکسیر  
 بخش دی ارض بسیط اور ہوا کی تسخیر  
 اس گزر گاہ میں ہو رائج مشک و غیر  
 بخت کو سعد بنادے گی یہ روشن تحریر  
 ہو گیا ہو جو کوئی گردشِ دوراں کا اسیر

## مطلع ششم

### مدح حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید قادری قدس سرہ

شمس مارہرہ کے پرتو سے بنا بدر منیر  
 عین حق، مظہر فیضِ برکات، عبد مجید  
 ہر کڑی میں وہی جھنکار وہی تابانی  
 بس کہ ہے کاشفِ استارِ حقیقت جلوہ  
 رہتا ہے اس کے لیے بیت کشادہ آغوش  
 قرب یہ ہے کہ اٹھا دے وہ اگر دستِ دعا  
 عین حق ہیں یہ پکڑ لے جو کوئی ان کا ہاتھ  
 شاذ ہوتا ہے کوئی ایسا فدا کار مرید  
 اس کو دنیا کے غم و درد سے آزادی ہے  
 نور نے اس کے کیا ملک دل و جاں تسخیر  
 ملک عرفاں کا جسے بخشا گیا تاج و سریر  
 قادری سلسلہ ہے ایک مُذہبُ زنجیر  
 قلب تیرہ کو جلا بخشے نظر کی تنویر  
 وہ کہ جو عتبہ محبوب سے ہولدت گیر  
 فضلِ مولا سے سنور جاتی ہے بگڑی تقدیر  
 گویا پکڑے ہوئے اللہ کی ہے جل مریر  
 وہ ارادت کی ادا ناز کرے جس پر پیر  
 جو دل و جاں سے ہوا ان کی محبت میں اسیر

## مطلع ہفتم

عرض پرداز ہے سرکار کا اک عبد حقیر  
 اس دلِ تار میں کتنی ہی تمنائیں ہیں  
 شیخِ سالم سے فزوں زینتِ سجادہ ہو  
 مثلِ میخوار و ولی، لطف و صبا و منظور  
 اور اگر زیست کی لذت مری قسمت میں نہیں  
 تیرا بیمار شفا پائے عطا ہو صحت  
 تیرے الطاف و عنایت سے ہو پورا مرا کام  
 میں جہاں بھی رہوں تیری ہی حفاظت میں رہوں  
 ہادی زار بہر حال ہے اس در کا گدا  
 پہنے ہے فخر غلامی کے جو طوق و زنجیر  
 سب سے پہلے نگہ لطف سے عفو و تقصیر  
 ان سے ہوا ہل ارادت کے دلوں میں تنویر  
 یہ گنہگار بھی ہو تیری محبت میں اسیر  
 یہ تو ممکن ہے بدل جائے یہ کھوٹی تقدیر  
 اور وہ عیش فراواں سے رہے لذت گیر  
 میں تو ناکارہ ہوں بنتی نہیں کوئی تدبیر  
 تاکہ بہکا نہ سکے دل کو کبھی نفسِ شریر  
 اس کے انجام مقاصد میں نہ ہوا ب تاخیر

☆☆☆



یورشِ رنگ و بو سے کیا ہوگا  
آرزو سے ملا ہے کیا اے دل  
پھول ہر سو کھلیں جہاں مہکے  
ساتھ چھوڑیں گے یاد کے پیکر  
دل ہو جکڑا وفا کے رشتے میں  
میں تری جستجو میں کھویا ہوں  
رک سکے گی بہار پل دو پل  
چاہیے اک جنوں طلسم کشا  
خاک ڈالو بگولوں کے سر پر  
”آپ“ کی حد کو پار کر لیں آؤ  
سب تو کہہ سن لیا نگاہوں نے  
جانتے پھر رفو سے کیا ہوگا  
حسرتِ آرزو سے کیا ہوگا  
ایک دل کے لہو سے کیا ہوگا  
شغلِ جام و سبب سے کیا ہوگا  
صرف طوقِ گلو سے کیا ہوگا  
اب مری جستجو سے کیا ہوگا  
ماتم و ہاؤ ہو سے کیا ہوگا  
اس خرد حیلہ جو سے کیا ہوگا  
ہوں جو ہیں تند خو سے، کیا ہوگا  
ورنہ اس ما و تو سے کیا ہوگا  
حاصل اب گفتگو سے کیا ہوگا

شعر مانگے ہے خونِ دل ہادی  
آرزو کے لہو سے کیا ہوگا



ہاں قاتلِ دل، بائی جفا جز وہم تمنا کوئی نہ تھا  
دزدیدہ نگاہِ جانِ حیا کیا تیرا اشارا کوئی نہ تھا

وہ دیکھتے کیا سن بھی نہ سکے شاید کہ فغانِ دیدہ و دل  
اے حسنِ تغافل تیرے سوا کہنے کو بھی پردا کوئی نہ تھا

وہ دل کہ دھڑکنا بھول گیا سینہ میں تڑپتا کس لیے ہے  
اے شورِ قیامت تیری قسم یہ پوچھنے والا کوئی نہ تھا

تھا غم ہی غم ہستی بھی مگر ان کے غم پنہاں تیرے بغیر  
مرنے کے بہانے لاکھ سہی جینے کا سہارا کوئی نہ تھا

اٹھتی ہے نگاہِ اہل جنوں اب غنچہ و گل کی خیر نہیں  
گلشن میں بہار اترائی بہت جب محو تماشا کوئی نہ تھا

اب دور نہیں وہ دن بھی کہ تم انجامِ تغافل دیکھ سکو  
اس وقت بھی اپنے غم کی قسم تم یہ ہی سمجھنا کوئی نہ تھا

وہ کہتے ہیں ہادی خوب ہو تم مرتے ہو مگر مرتے ہی نہیں  
مرنے کے لیے جینے کے سوا کیا کہیے کہ چارہ کوئی نہ تھا





رات کیوں آتی ہے ہر سمت بکھیرے تارے  
 جانے کس دل کے پراگندہ خیالوں کی طرح  
 وائے ناقدریٰ ایام کہ سمجھا جاؤں  
 اپنی محفل میں ہی نادیدہ جمالوں کی طرح  
 حسن مغرور کی دزدیدہ نگاہی توبہ  
 قلب مرحوم کے ناکردہ سوالوں کی طرح  
 چشم پر آب کی قسمت میں نہ تھی کوئی کرن  
 چاہے برسات کے بجائے اجالوں کی طرح  
 بزم عشرت کے دیکتے ہوئے گورے چہرے  
 دل میں انسان کے ڈس لیتے ہیں کالوں کی طرح  
 غیر کے ذہن سے سوچو تو ہماری ہستی  
 مضحکہ خیز ہے سنجیدہ خیالوں کی طرح  
 ہائے یہ گرسنہ امید کہ تارے دیکھے  
 جو نظر آتے ہیں اوندھے ہوئے پیالوں کی طرح  
 ٹکٹکی باندھے ہوئے دور سے دیکھے جاؤ  
 زندگی بن گئی رم خوردہ غزالوں کی طرح  
 وہ بھی دن دور نہیں ذکر تمہارا ہادی  
 لب پہ آئے گا مگر فن کی مثالوں کی طرح

## بیت بازی

﴿الف﴾

اُف بھی کریں تو ہم نہیں وارفتگانِ شوق سو تیر ناز و غمزہ کرو دل کے آر پار  
 اعجازِ چشمِ شوقِ تصور تو دیکھتے اک بے نگہ نگاہ تھی محمل کے آر پار  
 اب اس مقام پر ہے یہ مشتاقِ تیز گام اک رہگذارِ شوق ہے منزل کے آر پار  
 آدابِ ضبطِ درد اگر بچ میں نہ آئیں آہ جگر خراش تھی محفل کے آر پار

﴿ب﴾

بجلی چمک رہی تھی ابھی آشیاں سے دور دھڑکا تو تھا قلوبِ عنادل کے آر پار  
 بارِ دگر وہ سامنے آتے ہیں، خیر ہو پہلی نظر ہی جن کی ہوئی دل کے آر پار  
 بسمل کوخوں بہا کی ضرورت نہیں رہی دل کا لہو ہے خنجرِ قاتل کے آر پار  
 برما گئی نگاہِ غضبِ قلبِ زار کو جس طرح کوئی بور کرے سل کے آر پار

﴿پ﴾

پھر اس طرف وہ دیکھتے ہیں تان کر بھنویں ہوتی ہے ہائے تیغِ دو دم دل کے آر پار  
 پہنچا جو تھک کے منزلِ مقصد پہ پائے شوق راہیں نکالیں عزم نے منزل کے آر پار  
 پاپی پیسے! ہائے تری پی، کہاں کی کوک اک زخمِ ڈالتی ہے مرے دل کے آر پار

﴿ت﴾

تم نے تو ایک ”اُونھ“ سے کیا قصہ مختصر اک تیر ہو گیا دلِ سائل کے آر پار  
 تیر نگاہِ ناز سے بچتا نہیں کوئی بے روک ٹوک ہوتا ہے ہر دل کے آر پار

”تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں“ کس کی نظر کا تیر ہوا دل کے آر پار

﴿ث﴾

ٹوٹا طلسم خواب، حقیقت عیاں ہوئی تارکیاں جھلکتی ہیں جھلمل کے آر پار  
ٹھہرے گا کس مقام پہ اب کاروان شوق بے نام راہ جاتی ہے منزل کے آر پار  
ٹکرائی چشم شوق جو ان کی نگاہ سے کیا چیز تھی کہ ہو گئی بس دل کے آر پار

﴿ث﴾

”ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما“ وہ کیا مرے گا عشق ہو جس دل کے آر پار  
ثابت ہوا کہ تیر قضا سے مضر نہیں اٹھتے ہی وہ نگاہ ہوئی دل کے آر پار  
ثانی کہاں سے آئے گا اس بے مثال کا پہلی نظر ہی جس کی ہوئی دل کے آر پار

﴿ج﴾

جب بھی نگاہ شوق اٹھی وہ سنبھل گئے شاید کہ ہو وہ پردہ محمل کے آر پار  
جرم نگاہ ناز کی اتنی کڑی سزا اک موجہ عتاب ہوئی دل کے آر پار  
جب یاد آ گئی ہیں وہ محشر خرامیاں خوابیدہ آرزوئیں ہوئیں دل کے آر پار

﴿ج﴾

”چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی“ چاہے ہوا کرے جگر و دل کے آر پار  
”چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں“ سنبھلا نہ تھا عدو کہ ہوئی دل کے آر پار  
”چھٹے نہیں مواخذہ روز حشر سے“ چھینے ہیں خوں کے دامن قاتل کے آر پار

﴿ح﴾

حاصل یہی کہ خیر سے حاصل نہیں کوئی یہ میرا غم ہے کیوں ہو کسی دل کے آر پار  
حسرت نکالی دیدہ محروم دید نے دیکھا ہے خوب خنجر قاتل کے آر پار

حیرت بنی حجاب رخ بے نقاب دوست      ہنس ہنس کے دیکھتے رہے وہ دل کے آر پار

﴿خ﴾

خمیازہ حیات ہے وہ کیفِ دردِ عشق      ہودھر کنوں میں جس کی خلش دل کے آر پار  
خارِ الم سے ہوگی نمودِ بہارِ نو      ہونے تو دو قلوبِ عنادل کے آر پار

﴿د﴾

دل کیا گیا غموں سے فراغت ہی مل گئی      اب اک خلا ہے سینہ بسمل کے آر پار  
داغِ فراق کوئی نظر پائے گی کہاں؟      مدت ہوئی کہ ہو گئے وہ دل کے آر پار  
”دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو“      حسرت کے کتنے زخم ہیں اس دل کے آر پار

﴿ڈ﴾

ڈالی جدھر بھی ایک اچھتی ہوئی نگاہ      بجلی تڑپ کے ہو گئی ہر دل کے آر پار  
ڈوبے ہیں جو محیطِ غمِ عشقِ دوست میں      وہ ہو گئے ہیں موجہٴ وسائل کے آر پار  
ڈھونڈا تو ایک غم ہی ملا حاصلِ حیات      حسرت کے چند زخم رہے دل کے آر پار

﴿ذ﴾

ذوقِ جراحتِ غمِ پنہاں کی خیر ہو      ہوتا ہے لطفِ سینہٴ بسمل کے آر پار  
ذرہ ہے آفتاب کی طلعت لیے ہوئے      جلوے جھلک رہے ہیں مرے دل کے آر پار  
ذکرِ بہار اور اسیروں کے سامنے؟      موجِ صبا نے تیر کیے دل کے آر پار

﴿ر﴾

”رائجن شعاع“ بن گئی میری نگاہِ شوق      نکلی ہے صاف صاحبِ محمل کے آر پار  
راحت اسی کا نام ہے دنیائے عشق میں      ہو شوق و آرزو کی کسک دل کے آر پار  
رازِ درونِ سینہٴ زباں تک نہ آ سکا      سوزِ غمِ فراق ہوا دل کے آر پار

﴿ز﴾

زہراب زندگی ہے غمِ عشق تو نہیں وہ دل کی آبرو تھا یہ ہے دل کے آر پار  
 زخمہ زنِ حیات کی بیدردیاں نہ پوچھ ضربوں کے ساتھ زخم ہوئے دل کے آر پار  
 زیر و زبر ہے عالمِ زنداں کا انتظام شورِ فغاں ہے طوق و سلاسل کے آر پار

﴿س﴾

سرکارِ دل پہ بھی تو لگا دیجے بندشیں جوشِ جنوں ہے قیدِ سلاسل کے آر پار  
 ساری ہے فیضِ چشمِ فسوں ساز ہر طرف ہے شوقِ نا تمام ہر اکِ دل کے آر پار  
 ساغر سے چھلکے بادۂ گلفام جس طرح ویسے ہی حسرتیں دلِ بسمل کے آر پار

﴿ش﴾

”شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے“ آسانیاں ہیں عقدۂ مشکل کے آر پار  
 شاید اسی کو کہتے ہیں خندہ بسوریاں ہنستے ہیں درد ہوتا ہے جب دل کے آر پار  
 شفافِ مثلِ جامِ بلوریں ہے لوحِ دل جھلکے ہے تیرا شوق مرے دل کے آر پار

﴿ص﴾

صورت کا حسن کیا ہے جو سیرت بھلی نہ ہو الماس کی کنی ہے کہ ہو دل کے آر پار  
 صبح بہار و گوشۂ تہائیِ قفس ہو گوئی ہر ایک کرنِ دل کے آر پار  
 صرصر کی موجِ موج اڑاتی ہے برگِ گل کرتی ہے تیر قلبِ عنادل کے آر پار

﴿ض﴾

ضد اور کیسی ”پیاز کا گودا نکالے“ سمجھائے کون؟ ہوتے ہیں بس چھلکے آر پار  
 ضو ریز سوزشِ دلِ پروانہ ہو گئی فانوسِ شمعِ رونقِ محفل کے آر پار  
 ضائع نہیں گیا تری ترچھی نظر کا تیر سیدھا وہ ہو گیا ہے مرے دل کے آر پار

﴿ط﴾

طوفانِ ناز ہوتا ہے ساحل سے بے نیاز موجِ اک ادا سے ہوتی ہے ہر دل کے آر پار  
 ”طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھاتے“ کی تھی نظر کہ درد ہوا دل کے آر پار

”طرزِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے جنگ“ دونوں ہی آفتیں ہیں مرے دل کے آر پار



ظلم اس ادا سے کرتے ہیں احباب ان دنوں جیسے کہ برما ہوتا ہے مل مل کے آر پار  
ظاہر پرست دیکھ سکے مسکراہٹیں وہ درد و غم نہیں جو ہوا دل کے آر پار  
ظرف آزما رہے ہیں وہ ارباب ذوق کا رہنے نہ پائے کچھ جو نہ ہو دل کے آر پار



عالم ہے داغِ آرزوئے کو بہ کو کا نام وہ جی اٹھا کہ غم ہوا جس دل کے آر پار  
عزمِ بلند و شوقِ فراواں نہ پوچھیے کتنے جہاں ہیں جادہ و منزل کے آر پار  
عرضِ نیازِ شوق پہ تیوری چڑھا کے دیکھ ایک اور وار سینہ بسمل کے آر پار



غنجی سے پھول، پھول سے پژمرده برگِ گل خارِ المِ قلوبِ عنادل کے آر پار  
غم ہائے دہر سے اسے مل جاتی ہے اماں پیکانِ دردِ عشق ہو جس دل کے آر پار  
غیر از نگاہِ پردہِ حائل نہیں کوئی سو بار دیکھا پردہِ محمل کے آر پار



فرزانی ہے نور مگر نور بھی تو بس ہوتا ہے صرف جوہرِ قابل کے آر پار  
فانوسِ نورِ شمعِ مقید نہ کر سکا ہے ان کا جلوہ پردہِ محمل کے آر پار  
فرقِ بیانِ ما و شما گفتنی بود آؤ نکل چلیں حدِ فاصل کے آر پار



قرباں اس ایک نیم نگاہی پہ لاکھ دل جو دیکھتے ہی دیکھتے ہو دل کے آر پار  
قائل نہیں ہے کون کسی کی نگاہ کا ہر آن دیکھتی ہے وہ ہو دل کے آر پار  
قانع کسی کے تیرِ نظر پر نہیں ہے شوق پیکانِ غم خود اس نے کیے دل کے آر پار



کیا جانتے کہ پہنچے کہاں کاروانِ شوق      جادہ بنائے جاتا ہے منزل کے آر پار  
کافور ہو گئیں غمِ دنیا کی کلہنٹیں      جب ان کا دردِ عشق ہوا دل کے آر پار  
کب ہوگی صبح، صبح تمنا کہیں جسے      ایسی نہیں کہ زخم کرے دل کے آر پار

﴿گ﴾

”گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر“      جو بات کی وہ ہوگئی بس دل کے آر پار  
گرمِ خرامِ ناز ہے موجِ اک ادا کے ساتھ      ہے پاشستگی دلِ ساحل کے آر پار  
گم ہوگئی کلرک کے فیتہ میں زندگی      کس کی مجال دیکھ لے فائل کے آر پار

﴿ل﴾

لے! آئی یادِ شمعِ فروزاں لیے ہوئے      دل! ہوگی روشنی تری محفل کے آر پار  
لو دے اٹھے ہیں داغِ تمنا شبِ فراق      شعلے لپکتے ہیں جگر و دل کے آر پار  
لازم ہے ذوقِ دید بہ اندازہٴ جمال      کر پھر نگاہِ پردہٴ حائل کے آر پار

﴿م﴾

مشکل ہے خالِ لب کی حلاوت کی گفتگو      یہ کہیے تیز چاشنی ہے تل کے آر پار  
ملتے ہی ان کی چشمِ فسوں ساز سے نظر      پیکانِ ناز و غمزہ ہوا دل کے آر پار  
”منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی“      کرنا نہیں ہے طعن کسی دل کے آر پار

﴿ن﴾

زغہ ہے دردِ عشق و غمِ روزگار کا      ہر ایک چاہتا ہے کہ ہو دل کے آر پار  
نظریں ملیں تو ہوش کسے تھے کہ ہو خبر      کب آیا تیر کب ہوا وہ دل کے آر پار  
”نظریں ملا کے آپ نے افسانہ کر دیا“      وہ دردِ بے پناہ کہ تھا دل کے آر پار  
”ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں“      ہے کون جس کے تیر نہ ہو دل کے آر پار  
نظروں کی قید سے ہے جو آزاد چشمِ شوق      ہم دیکھ لیتے ہیں تری محفل کے آر پار

﴿و﴾

وہ تیر بے کماں جسے ان کی نظر کہیں  
واماندگی سے شوقِ فراواں کو بیر ہے  
وہ دیکھتے ہیں نظروں سے بے نیاز  
”وہ بے رُخی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں“  
وہ زخم دے گئے ہیں کہ آتی رہے گی یاد  
اچھا ہے راستہ رہے منزل کے آر پار  
ہوتا ہے مثلِ برق وہ ہر دل کے آر پار  
نکلا چلا گیا حد و منزل کے آر پار  
وہ دیکھتے ہیں پردہِ حائل کے آر پار  
ہونے دو زخم ہوتا ہے گردل کے آر پار  
اچھا ہے راستہ رہے منزل کے آر پار



ہر صبح و شام وعدہ فراموشیوں کے ساتھ  
ہوتے ہیں سنگِ دل کبھی آنسو سے ٹس سے مس  
ہے کیا ہی خوب چارہِ محرومی حیات  
تیر قضا کہ ہو دلِ بسمل کے آر پار  
اک تازہ زخم ڈال دیا دل کے آر پار  
بوندیں پہنچ بھی سکتی ہیں کیا سل کے آر پار؟  
تیر قضا کہ ہو دلِ بسمل کے آر پار



یہ کون آ رہا ہے کہ جی سُن سے ہو گیا  
یہ ہیں تصورات کی پرواز کی حدیں  
یوں دیکھتے ہیں جیسے ادھر دیکھتے نہیں  
یادوں کے قافلوں کو لیے آ رہی ہے شام  
یوں مسکرا کے دیکھ کہ کلیاں چمک اُٹھیں  
ایسے نہیں کہ زخم ہو ہر دل کے آر پار  
آہٹ سی تھی کہ تیر ہوا دل کے آر پار  
ہے پردہِ تعین حائل کے آر پار  
ہوتی ہے اور ایسی نظر دل کے آر پار  
گذریں گے رات پھر وہ مرے دل کے آر پار  
ایسے نہیں کہ زخم ہو ہر دل کے آر پار







دیکھیں رہ سکتی ہے کس طرح تجلی روپوش  
ہوش دیوانے کو آئے تو بقدرِ رم ہوش

راہ گم کردہ تمنا کو کہاں تک ڈھونڈوں  
قلب صد چاک ہے اک ذرہ صحرا آغوش

سرحد شام و سحر سے ہے جدا منزلِ عشق  
مٹ بھی سکتی ہے کبھی غم کی خلش ہمراہ دوش

ہائے دزدیدہ نگاہوں کی ادب آموزی  
دل میں ہنگامہ محشر سا ہے لیکن خاموش

تیرے محروم بھی سرشار ہیں بے منتِ جام  
عشق ہے ساقی لب تشنہ و میخانہ بدوش

جادۂ عشق میں ہے ایک مقام ایسا بھی  
دامنِ شوق میں ہو جاتی ہے منزل روپوش

کون سمجھے گا یہاں رازِ جنوں اے ہادی  
معنی ہوش سے واقف نہیں دیوانہ ہوش

پھیر کر اس نے نظر چہرے پہ ڈالا آنچل  
 دیکھتے دیکھتے ہی بیت گئی شام غزل  
 چہرے پر پھیل گئیں ایسے بکھر کر زلفیں  
 چاند کو گھیر لیں جس طرح سمٹ کر بادل  
 کبھی سوچا بھی نہ تھا میں نے کہ کل کیا ہوگا  
 کر دیا دل کو مرے آج ہی اس نے بے کل  
 پھر لب و کاکل و رخسار کی یاد آئی ہے  
 پھر فضائے دل محروم میں لہرائی غزل  
 گیسو لہرائیں تو چھا جائیں گھٹائیں کالی  
 طرہ کاکل پیچاں ہو سمٹ کر بادل  
 آتا ہے اس کے چلے جانے کا رہ کے خیال  
 روز و شب ہے دل مجبور میں برپا ہلچل  
 خواب ادھورے تھے کہ فرقت کی سحر آہنجی  
 بن نہ پایا تھا ابھی ٹوٹ گیا تاج محل  
 کون کہہ سکتا ہے کب ہو جسے فردا کہیے  
 یوں تو روزانہ ہوا کرتی ہے ہر آج کی کل  
 بن گئے مانع دیدار ڈھلکتے آنسو  
 زندگی بھر جو ترے سر سے نہ ڈھلکا آنچل  
 رات کے سخت اندھیرے میں بھی جی لگتا ہے  
 آئی ہے کیا انھیں آنکھوں سے چرا کر کاجل

آنسو لہرانے لگے آنکھ میں، دل ہے بے چین  
 چھائی ہے کیسی گھٹن اٹے ہیں ہادی بادل

(۱۹۷۳ء)

☆☆☆

☆

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم  
شکایتِ غمِ دل کیا کریں گے کیا معلوم

بہار آئی گلوں نے کیے گریباں چاک  
یہاں بھی ہوتا ہے اپنا ہی سلسلہ معلوم

یہ دھجیاں ادب آموزِ دستِ وحشت ہیں  
نہیں تو آپ کے دامن کا فاصلہ معلوم

اُٹھی تو تھی نگہِ شوق ان کی محفل میں  
پھر اس کے بعد کسے کیا ہوا خدا معلوم

یہی تو فکر و نظر کا ہے ماحصلِ ہادی  
نہ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم

☆☆☆



جلوہ حسن ہے نظر دشمن  
پاتا کیا عشق کی خبر دشمن  
عشق ہی وہ مقام ہے کہ جہاں  
ہوش و مستی میں اتنا بیر نہیں  
ناز، انداز، عشوہ، غمزہ، ادا  
ہیں عجب دردِ عشق کے آداب  
میں کہاں آ پھنسا الہی خیر  
وسعتِ کائنات ہو ہم ہوں  
بادلوں سے کہیں رُکی ہے کرن  
دی شعورِ حیات کو مہمیز

شوق اپنا سہی مگر دشمن  
نکلی اپنی ہی چشم تر دشمن  
دوست قاتل ہے، چارہ گر دشمن  
جتنی ہے عقلِ خیرہ سر دشمن  
ایک وہ کیا، ہے گھر کا گھر دشمن  
آہ کھینچو مگر، اثر دشمن  
تھے ازل سے ہی خیر و شر دشمن  
شوق کا ولولہ ہے گھر دشمن  
کیا بگاڑیں گے یہ سحر دشمن  
در حقیقت ہے دوست ہر دشمن

کیا اٹھاؤ گے تنگ بے ہنری  
ہے جو ہادی جہاں ہنر دشمن

(۱۹۷۲ء)

☆☆☆

☆

زیست بے چشمِ التفات کریں      کیسے دن شب کو دن کو رات کریں  
صبح یوں زندگی کی رات کریں      ان کے غم کو غمِ حیات کریں  
وہ اگر چشمِ التفات کریں      نذر ہم دل کی کائنات کریں  
آؤ دل سے ہی ان کی بات کریں      کچھ تو ہلکا غمِ حیات کریں  
اور مشکل ہے یہ کہ ہم دل کو      محرمِ جرأت و ثبات کریں  
کہہ چکا میں تو، آپ کی نظریں      یوں اشارے جو بات کریں  
طالبِ دید اٹھا کے قیدِ نظر      جلوہ حسنِ بے جہات کریں  
زندگی خود گزشتہ ہے تو کیا      شکوہ دردِ بے ثبات کریں  
ہم ہیں اور شامِ غم کی تنہائی      کون ہے؟ کس سے دل کی بات کریں  
وہ نہ دیکھیں گے کھول کر آنکھیں      کتنی ہی ہم گذارشات کریں  
اشک پی پی کے مسکراتے رہیں      زندگی کے غموں کو مات کریں

تھی مشیت یہی کہ ہم ہادی  
اب بسر یہ غموں کی رات کریں

(۱۹۷۳ء)

☆☆☆



خوگرِ ساغرِ نظر تھا میں  
مرکزِ لطف کس قدر تھا میں  
جتنا منظورِ ہر نظر تھا میں  
دور از راہ و راہبر تھا میں  
ان کے جلووں کی رہگذر تھا میں  
میں ہی میں یا تو، یا نہیں کچھ بھی  
زخم سے دل میں کی ہے گلکاری  
سامنے آئے وہ، نہ تھا کچھ بھی  
غم نے مجھ کو سمجھ لیا منزل  
”میں“ سے قطع نظر جو کی تو کھلا  
متلاشی سی چشمِ ساقی تھی  
آرزوؤں کا تھا ہجوم ایسا  
گزرے دامن جھٹک کے ”تیز قدم“ (۱)  
چاہتے بھی تو کیا سمجھ پاتے  
خود ہی جل بجھتا ہو جو اے ہادی  
وہ شررِ قصہ مختصر تھا میں

(۱۹۸۳/۲/۲۵ء)

۱۔ گزرے کا فاعل

۲۔ ”خندہ لب“ اور ”چشمِ تر“ بغیر اضافت (ہادی القادری)



آواز شکست ساز ہے یہ اک نغمہ بے آواز نہیں  
یعنی کہ ہماری قسمت میں انجام تو کیا آغاز نہیں

ہاں تیرے لیے بھی مایوسی سرمایہ فخر و ناز سہی  
اے شمع سحر تجھ میں لیکن دل کے سے سبھی انداز نہیں

فرمائیں تکلف کیوں آخر وہ تازہ بتازہ جور کریں  
ہے کون سا غم جس کی خاطر ہر وقت درِ دل باز نہیں

اس طرح نگاہیں مضطرب ہیں اللہ رے جذبِ حسن فریب  
جیسے کوئی پوچھے لیتا ہے وہ راز کہ شاید راز نہیں

دل ڈوب گیا آتے آتے ہونٹوں پہ ہی آہ باز پسیں  
کیا وجہ شکست ساز ہے وہ جو نغمہ اسیر ساز نہیں

یہ کون سی منزل کی جانب ہے آج رواں تو ذوق جنوں  
بیتابی قلب ویراں کیوں محتاجِ نگاہ ناز نہیں

جینے کی مصیبت باقی ہے اور زیست کبھی کی چھوڑ چکی  
گویا کہ حقیقت میں ہادی اب موت قدر انداز نہیں

حسرتیں لاکھ سہی ایک نظر دیکھو تو      ہے کرم طرز تغافل بھی مگر دیکھو تو  
 ہونہیں پاتی مرے دل کو خبر دیکھو تو      رکھتی ہیں آرزوئیں طرفہ ہنر دیکھو تو  
 اب بھی ہے سرمہ ارباب نظر دیکھو تو      اور کیا حال ہو جو بار دگر دیکھو تو  
 کیسے اتر رہے ہیں برق و شرر دیکھو تو      ابھی کھل جائے بھرم ایک نظر دیکھو تو  
 دشت غربت کو بنا رکھا ہے گھر دیکھو تو      زیت کس شان سے ہوتی ہے بسر دیکھو تو  
 راکھ ہو جائے دل زار ہے اس کا نصیب      کر لیں کچھ کسب ضیاء شمس و قمر دیکھو تو  
 جان لے قلم مؤاج حقیقت اپنی      جوش پر آئے ذرا دیدہ تر دیکھو تو  
 فرض ہے دل پہ بہر حال تمنا کرنا      بات قسمت کی ہے کیا آئے نظر دیکھو تو  
 تہمت عشق سے ممکن ہے کشاد دل ہو      راز سربستہ کے کوچے سے گزر دیکھو تو  
 مسلک اہل نظر اہل نظر ہی جانیں      ہے یہی شکریہ چشم و نظر دیکھو تو  
 کتنے خوش رنگ ہیں پلوں پہ لرزتے آنسو      قلب صد چاک کی یہ سلک گھر دیکھو تو

دل کبھی رونا بھی چاہے تو ہنسی آتی ہے  
 ضبط غم کرنے کا ہادی یہ اثر دیکھو تو

(۱۹۸۹/۷/۵ء)



دل میں ہر جلوہ صد رنگ سمو لو دیکھو      میری دنیا میں مگر آنکھ نہ کھولو دیکھو  
 حسن ہے، کیف ہے، مستی ہے، عجب عالم ہے      اک ذرا خواب سے بیدار تو ہو لو دیکھو  
 صبح پھر وعدہ فردا سے نبٹنا ہوگا      ہجر کی شب میں تو آرام سے سولو دیکھو  
 کس کو آنکھوں نے نظر سے بھی چھپا رکھا ہے      دیکھنے ہی پہ جو اصرار ہے تو لو دیکھو  
 غنچہ دل مرا سو خار الم رکھتا ہے      پھول کے شوق میں کانٹے نہ چھولو دیکھو  
 ریت کی مینڈھ سے موجیں بھی کہیں رکتی ہیں      کھیل ہی کھیل میں دامن نہ بھگولو دیکھو  
 رسن و دار سے آسان گذر جانے دو      عقدہ کا کل خمدار نہ کھولو دیکھو  
 ابرو تنٹے ہیں تو دل اور دھڑک اٹھتا ہے      ایسے نادان پہ شمشیر نہ تولو دیکھو  
 ناخدا عشق کا ناموس بھی لے ڈوبے گا      اپنے ہاتھوں سے ہی کشتی کو ڈبولو دیکھو

دیکھئے ہادیٰ مرحوم یہ کون آیا ہے

منہ سے بولو نہ سہی آنکھ تو کھولو دیکھو

(۱۹۷۰ء/۷/۱۴)



گاہے ہنسنا تو گاہے نوحہ گری  
ہائے اہلِ خرد کی بے خبری  
عالم عالم تھی ان کی جلوہ گری  
جانے کیا مدعی خود نگری  
مدعی نظر کی بے بصری  
زندگی سے ملاؤ آنکھ تو بات  
جس کو بھائے ہیں درد کے انداز  
آزمائے نہ فتنہ دوراں  
بے حجابانہ دید بے کم و کیف  
تیرے قربانِ ناوکِ دل دوز  
جام پر جام سب کو دے ساقی

آدمی، آدمی ہے جن نہ پری  
پردہ ہے ادعائے پردہ دری  
ہائے کجختِ دل کی بے بصری  
منتہائے خبر ہے بے خبری  
ہے نظر خود شبابِ جلوہ گری  
باہمہ ادعائے دیدہ وری  
کیا اٹھائے گا نازِ چارہ گری  
عاشقِ نیم جاں کی بے جگری  
اللہ اللہ نگاہ بے نظری  
خوب کی زخمِ دل کی بچیہ گری  
اور مینا رہے بھری کی بھری

چشمِ رحمت کو بھا گیا ہادی  
یہ ترا اعتراف بے ہنری

(۱۹۷۲ء)

ترے جلوہ سے ہوئی ہے جو نمود خوش جمالی      نہ قمر میں ویسی تابش نہ شفق میں ویسی لالی  
 نہ وجود کوئی تجھ سا ہے نہ پیکر خیالی      مرے بے نظیر تو خود ہے مثال بے مثالی  
 کوئی سمجھے کیا کہ کیوں ہے مرے چہرہ پر بحالی      انھیں وہم ہے کہ شاید گیا ان کا وار خالی  
 انھیں سجدہ ریزیوں سے ہوئی اوج کی نمائش      کہ ہے سنگ آستان پر ہی بنائے قصر عالی  
 یہ طلوع مہر ہے یا کہیں آگ لگ رہی ہے      ہے نمود صبح رنگیں کہ ہے میری خوش خیالی  
 مئے وجم کے تذکروں سے مرے کان پک گئے ہیں      اے ذرا اٹھا تو دینا مرا ساغر سفالی  
 مجھے زندہ ہی سمجھتے جو ہے سوز و ساز الفت      کہ ہے عاشقی حقیقت، مری زندگی خیالی  
 غم عشق اور ہوس میں ہے بس اتنا فرق سمجھو      کہ الٹ گیا ہے جیسے وہ عمل کہ ہے جلالی  
 وہ نہ دیں شراب لیکن مری سمت دیکھ تو لیں      مجھے بخش دے گا مستی یہی میرا جام خالی  
 جو یہ نوک خار مرگاں سے ڈھلک رہے ہیں آنسو      ترے ذکر میں ہے شاعلمری سبھ لآلی

ہے دل اک کلی اور اس میں ہیں ہزار غنچے و گل  
 ہے نصیب کس کو ہادی یہ بہار لازوالی

(۱۹۷۲ء)



اس ایک سروِ ناز سے جو دو بدوسی ہو گئی  
یہی ہوا نا فصل گل لہو لہو سی ہو گئی

کسی کی چشمِ مست کی تسلیاں نہ پوچھیے  
نظر ادھر ملی نہیں کہ گفتگو سی ہو گئی

نہ جانے کس خیال میں جو دفعۃً میں کھو گیا  
ترے سوا سبھی کو ایک جستجو سی ہو گئی

سکون یاس پا چلا تھا میرا لخت لخت دل  
یہ کیا کیا کہ اس کو پھراک آرزو سی ہو گئی

وہی جو میری آنکھ میں تھی آنسوؤں کی شکل میں  
وہ حسرتِ حیات آج آجیو سی ہو گئی

نہ جانے کتنی منزلوں پہ منزلیں گزر گئیں  
نگاہ جب تمام شوق و جستجو سی ہو گئی

شکستہ دل کے درد کی تجلیاں تو دیکھتے  
بجھی بجھی سی زندگی بھی شمع رو سی ہو گئی

شبِ فراق ہادیٰ رہیں اضطراب کیوں  
تجائی نہاں ہر ایک روبرو سی ہو گئی

مجھ کو بے ضبط جو تم کہتے ہو یا رو تو سہی      تم مری طرح کوئی لمحہ گزارو تو سہی  
 دعویٰ عشق مگر ترک ہوں سے پہلے      لذت آئے گی مگر غم کو نکھارو تو سہی  
 آدمی سے ہی ذرا دل تو لگا کر دیکھو      خود تڑپ جاؤ نہ تم عقل کے مارو، تو سہی  
 خود بخود ہوگی تمہیں لذت ہستی محسوس      پہلے زہر اب الم دل میں اتارو تو سہی  
 تو نے دل کتنے شب و روز گزارے ہنستے      اب تلافی کے لیے صبح و مسارو تو سہی  
 مت سناؤ کہ نمائش کروں داغِ دل کی      ماند پڑ جاؤ نہ تم چرخ کے تارو تو سہی  
 میری نظروں میں بھی بے معنی نہ ہو میرا وجود      چاہے کچھ کر نہ سکوں مجھ کو پکارو تو سہی  
 جانِ گلزار کو مٹی میں دبا آیا ہوں      تم دکھاؤ تو کوئی پھول بہارو، تو سہی  
 یاد تنہائی کا احساس مٹا سکتی ہے      دل کی وادی میں دبے نقش ابھارو تو سہی  
 لو کسی یاد کو سینے سے لگاتا ہوں میں      خشک ہو جاؤ نہ تم وقت کے دھارو، تو سہی  
 وقت آتا ہے لیے ساتھ میں اپنا نغمہ      شامِ فرقت ہے تو پھر گیت نہ گا، رو تو سہی

لب ہیں خاموش تو کیا کان تو سنتے ہوں گے

نام سے ہادی مجبور پکارو تو سہی

(۱۹۷۳ء)

☆☆☆

☆

ہر قدم پر سوئے منزل دیکھتے  
کیا جمالِ جذبِ کامل دیکھتے  
کارواں در کارواں آلامِ زیست  
رہ گئے ہیں وسعتِ دل دیکھتے  
زندگی اک وہم بن کر رہ نہ جائے  
انتظارِ موج و ساحل دیکھتے  
وہ ابھی آغاز ہی آغاز ہے  
عمر گزری جس کا حاصل دیکھتے  
آہ اے سرگشتگانِ جشنِ گل  
رنگِ خونِ دیدہ و دل دیکھتے  
اس تمنا سے عبارت ہے حیات  
زندگی کو بالمقابل دیکھتے  
وہ بگولے جن سے طوفان تھرتھرائیں  
موجہٗ برق و سلاسل دیکھتے  
ہم بڑھے جاتے ہیں ہادی سوئے دوست  
دم بدم مشکل سے مشکل دیکھتے

(۱۹۵۲/۱۲/۲۳ء)

نہیں ہے دل میں مسلسل جیسے      آج کے بعد نہیں کل جیسے  
 جذبہ شوقِ فراواں مت پوچھ      زیست کا جبر مسلسل جیسے  
 آنسوؤں نے وہ سماں باندھا ہے      جوش پر جھرنوں کی کلکل جیسے  
 کون ہے جو نہ کرے شکوہ غم      جلتی ہے شمع مسلسل جیسے  
 پردہ در کو ہوئی کیا جنبش      سارے عالم میں ہے ہلچل جیسے  
 بجلی چمکاتا ہوا لکھ ابر      ان کا لہراتا ہو آنچل جیسے  
 دل دھڑکنے کی صدا یوں آئی      آپ کے آنے کی پچھل جیسے  
 یاد پیکر میں ڈھلی جاتی ہے      آگئی آج وہی کل جیسے  
 یاد کے آتے ہی ہو جاتی ہے      جذبہ شوق پہ صیقل جیسے  
 ہے وہ عالم کہ ہنسی آتی ہے      زیست کا لفظ ہے مہمل جیسے  
 بند آنکھیں ہوئیں نبضیں ڈوبیں      مسئلہ ہونے کو ہے حل جیسے

کیسا ویران ہے قلبِ ہادی  
 آرزوؤں کا ہو مقتل جیسے

سب عشرتیں جس سے تھیں میسر، وہی جو زیرِ مزار سوئے  
 نہ دل کا سویا نصیب جاگے، نہ دیدہ اشک بار سوئے  
 بلا سے سوتا ہے گر زمانہ میانِ شبہائے تار سوئے  
 جب آنکھ میں انتظار جاگے تو کیا دل بے قرار سوئے  
 یہ ہار کوئی گلے سے اپنے اتار کر اس نے رکھ دیا ہے  
 کہ میری آنکھوں سے جو گرے ہیں ان آنسوؤں کی قطار سوئے  
 وہ مست آنکھیں مندی مندی سی وہ رنگِ عارض اڑا اڑا سا  
 سبھی نے دیکھے ہیں نرگس و گل ہمیں نے دیکھی بہار سوئے  
 جھلک نظر آئی پر نہ پایا تو پھر تمنائے دید جاگی  
 جو سوئے ہم جاگ جاگ اٹھے، اٹھے تو ہم بار بار سوئے  
 جو ہیں اسیرِ سرورِ عشرت وہ جانیں کیا زندگی کی لذت  
 کبھی نہ بر اوجِ دار جاگے کبھی نہ بر نوکِ خار سوئے  
 جکڑ گئے ایسے جانے والے کہ تصفیہ ہو گیا ہے مشکل  
 مثالِ شمعِ مزار جاگے کہ یہ دل بے قرار سوئے  
 نظر جو پڑ جاتی اس کے رخ پر تو ہمتیں دل کی جاگ اٹھتیں  
 ترس گئیں خواب تک کو آنکھیں، جدائی میں ہم ہزار سوئے  
 وہ جس سے کتنے لطیف نغمے بکھیرے تھے دستِ زخمہ زن نے  
 وہی ہے سازِ دل شکستہ پڑے ہیں سب جس کے تار سوئے  
 ٹپکتے دیکھے ہیں فصلِ گل میں بھی اس کی آنکھوں سے اشکِ شبنم  
 خزاں کی آفت میں جھیل لوں گا خوشی سے جانِ بہار سوئے  
 سروں پہ سورج چمک رہا ہے پڑا ہے دنیا کا کارخانہ  
 دلِ حزیں کو سنبھالو اٹھو بہت بہ آغوشِ یار سوئے



کچھ اس طرح اشکِ خون دل سے ہوئے ہیں گلزارِ جیب و دامن  
کہ جیسے سینے پہ رکھ کے ہادی کے سر کوئی گل عذار سوئے  
(۱۹۷۳ء)



یوں خونِ دل نثار کیا اشکِ بار نے	رنگ چمن دکھا دیا دامن کے تار نے
کچھ ایسا طول کھینچا شب انتظار نے	مشکل ہوئے حیات کے لمحے گزارنے
دے دی شکست تاروں کو شبہائے تار نے	میدان سنبھال رکھا دلِ داغدار نے
کیا کھیل کھیلا زندگی مستعار نے	چھا کر دکھایا دہر پہ مشیت غبار نے
یہ دن دکھائے بے رُخی چشمِ یار نے	میں لگ گیا ہوں ہجر کی زلفیں سنوارنے
دیتا ہے کون ساتھ کسی بدنصیب کا	بھلایا تھوڑی دیر شب انتظار نے
پھولوں کے بس میں کب ہے خزاں کا مقابلہ	کچھ روز اپنا رنگ جمایا بہار نے
وحشت کا جھیلنا نہ تھی دامن کے بس کی بات	حق جنوں ادا کیا ہر ایک تار نے
آنکھوں سے دور ہونے پہ ملنا کہاں نصیب	چھوڑا نہ ساتھ درد کا آنسو کے تار نے
سینے میں بند رکھے ہیں جو داغہائے دل	بڑھتا ہے کون دیکھیں اب ان کو شمار نے
دیکھیں کہ کون رکھے گا اب لاجِ عشق کی	آئے تھے ایک ہم ہی یہاں دل کو ہارنے

---

☆ حضرت اقدس نے بتایا تھا بادیوں کی مٹی علم و فن کے لیے مردمِ خیر تھی پھر ایک بے پڑھے لکھے شاعر کا مطلع سنایا  
خلعتِ برہنگی کا جو بخشا بہار نے دستِ جنوں لگا مرے کپڑے اتارنے  
نہ جانے کیسے یہ مطلع یاد آ گیا اور قلم چل پڑا۔ (ہادی القادری)

ہادی بڑھا ہے شوق اسی آن بان سے  
چاہا قدم کو روکنا ہر ایک خار نے

☆☆☆

☆

رہتے تھے ہنستے بولتے کیسے، ابھی کی بات ہے  
اس نے نگاہ پھیر لی، اس کی خوشی کی بات ہے  
ہے تو ہر ایک شے وہی لگتی ہے کچھ عجیب سی  
یہ کوئی دل لگی نہیں، دل کی لگی کی بات ہے  
جب تری احتیاج تھی اور فزوں نفس نفس  
تیری جدائی اس گھڑی کیسی کمی کی بات ہے  
اپنے دلوں میں دوسرے پائیں نہ دیکھنے کی تاب  
جینا اور اس طرح بڑی بے جگری کی بات ہے  
شوق کی ناتمامیاں، درد کی بے قراریاں  
کون کہے گا جس طرح اور کسی کی بات ہے  
غم بھی کوئی نوشتہ ہے بھیگ کے مٹ ہی جائے گا  
کہتے ہیں خوب رولوں میں کتنی ہنسی کی بات ہے  
ایسے بڑے ہوئے، ملے، ساتھ رہے، بچھڑ گئے  
جیسے کہ سرگزشتِ عمر چار گھڑی کی بات ہے  
صبح ہوئی تو چھا گیا غم کا اندھیرا ہر طرف  
سب یہ مرے نصیب کی تیرہ شمی کی بات ہے  
تھا یہ نصیب کا لکھا مجھ پہ کھلے نفس نفس  
بے ترے زیست کس قدر دوسری کی بات ہے  
رند کی بے نیازیاں فکرِ جہاں میں کھو گئیں  
کس سے کہوں کہ لوسنو ایک ہنسی کی بات ہے  
غم کے ہجوم میں کہاں پائے گا لذتِ حیات

جو یہ کہے کہ عاشقی بے ضرری کی بات ہے  
ہادی زار و مضطرب پاؤں گے وہ نظر کہاں  
اور یہ دل کے زخم کی بخیہ گری کی بات ہے

(۱۹۷۲/۱۲/۱ء)



سارے جہاں سے بے نیاز نرگس نیم باز ہے      رخ پہ سکوں کی ہے جھلک آمدِ خوابِ ناز ہے  
شام ہوا ب کہ ہو سحرِ غم ترا بے نیاز ہے      تیرے بغیر زندگی ایک شبِ دراز ہے  
دید تھی آنکھ کا سرور یاد سے دل کی دھڑکنیں      اے مری باصرہ نواز غم ترا دلنواز ہے  
زیست ہے کرب موت کا، موت سکوں کی زندگی      تیرے دکتے چہرے نے فاش کیا یہ راز ہے  
باعثِ رنج و درد تھی آرزو کی کشمکش      جو بھی نگاہ پھیر لے فکر سے بے نیاز ہے  
کوئی کرے تو کیا کرے اس لیے صبر و شکر بس      مہلتِ زیست مختصر، کار جہاں دراز ہے  
حاصلِ غم ہے صرف غم، کارِ عبث ہے فکر کیوں      بگڑی بنا ہی دے گا جو مالک کار ساز ہے  
اب یہ کھلا حقیقتاً اصل ہے عشقِ معتبر      رنجِ فراق و شوق وصل، کچھ بھی نہیں، مجاز ہے  
میں جو تڑپ کے روؤں تو دے نہ سکے تسلیاں      بس یہ حیات و موت میں ماہِ الامتیاز ہے  
آنکھ میں میری تو کبھی دیکھ نہ سکتی تھی نمی      دیکھ کہ تیری یاد ہی آج جگر گداز ہے  
زخمِ غم کی ضرب سے ٹوٹے ربابِ دل کے تار      نغمہٗ نا تمام اب اور شکستہ ساز ہے  
مانگ لے اور مانگ کر ہادی مضطرب کو دے

بارش لطف عام ہے باب قبول باز ہے

(۱۹۷۲/۱۲/۱ء)

☆☆☆

## متفرقات

☆

جھوم اٹھا وجود روضۃ الجنتہ میں      پڑھتا ہوں درود روضۃ الجنتہ میں  
ہے نقش تصور میں کوئی نقش قدم      ہوں سر بسجود روضۃ الجنتہ میں

☆

میں کہ اک رند لا ابالی ہوں      خادم بندگان عالی ہوں  
کہتے ہیں سب گدائے خاک نشیں      میں کہ فرد صف نعالی ہوں

☆

بہت ہی گرم محشر میں خبر ہے ان کے آنے کی      ذرا جلدی سے کڑیاں جوڑ لوں اپنے فسانے کی  
کہانی تو کسی صورت نہ تھی سننے سنانے کی      مگر رحمت جو سرخی بن گئی میرے فسانے کی  
دل خوں گشتہ آنکھوں سے رواں ہو جاتا ہے ہادی      ادا جب یاد آتی ہے کسی کے مسکرانے کی

☆

مظہر شمع خیابانِ ازل      نور ہی نور تھی ساری صورت  
خُلُقِ قرآن کی مکمل تصویر      آیہ رحمت باری صورت  
برق و شیر نے معراج کی شب      ماہ و انجم کی اتاری صورت  
بولے صدیق کہ یہ سچے ہیں      کرتی ہے آئینہ داری صورت

---

☆ یہ نعت اور غزل کے وہ متفرق اشعار ہیں جو میں نے اپنے گھر میں سنے یا ٹیپ ریکارڈ میں خود حضرت ہادی کی زبانی سنے اور حافظے کے کسی گوشے میں محفوظ رہ گئے۔ (اسید الحق)



یہی سمجھو جو کوہِ طور و عرشِ کبریا میں ہے  
کہ جن کا رتبہ علیا ہمیشہ ارتقا میں ہے  
جھلک اس کی ادھوری آلہ قبلہ نما میں ہے

کہو کیا فرق معراجِ کلیم و مصطفیٰ میں ہے  
انوکھی قرب کی یہ شان محبوبِ خدا میں ہے  
جو کیفیتِ جمالِ حضرت خیرالوریٰ میں ہے



آئینہ صفات میں پر تو حسنِ ذات ہے  
حکم ہوا گناہگار تیرے لیے نجات ہے  
وجی جنابِ کبریا تیری ہر ایک بات ہے  
ہادی مضطرب انھیں بات میں کوئی بات ہے

وسعتِ رحمتِ تمام تا حدِ کائنات ہے  
جب مری چشمِ اشکبار لے گئی موتیوں کا ہار  
تیرے سوا کسے ملا ختمِ رسل یہ مرتبہ  
عفوِ گناہ اور پھر ایک گناہ گار کا



موت بھی سامنے آتے ہوئے شرمائے ہے  
رنجِ امروز تری یاد میں کھو جائے ہے

زندگی جب غم و آلام میں گھر جائے ہے  
فکرِ فردا سے گراں باریہ رات میں بھی



میں کہیں جاؤں ترے عشق سے نسبت ہے وہی  
اس طرف دیکھ مجھے تیری ضرورت ہے وہی

دل وہی درد وہی درد کی لذت ہے وہی  
اب کہ دنیا کو نہیں کوئی ضرورت میری



زندگی راہ بھٹک جاتی ہے  
دور تک ان کی مہک جاتی ہے  
مئے امروز چھلک جاتی ہے

ان کی گھنگور گھنی زلفوں میں  
پھول جب روند دیئے جاتے ہیں  
غمِ فردا کے وہ تیورِ توبہ



نگاہ ملتی رہے گاہ گاہ تھوڑی سی  
وہ ایک آس کہ ہے دل میں آہ تھوڑی سی  
وہ دیکھ سامنے باقی ہے راہ تھوڑی سی

ذرا تو رسمِ زمانہ نباہ تھوڑی سی  
سحر کے ساتھ کہیں وہ بھی ساتھ چھوڑ نہ جائے  
ذرا سی دیر تو ہمت نہ ہار اے راہی

# مقالات الاموى

## شاعر الشرق

لا يمكن لرجل حر مهذب ان لا يعرف محمد اقبال ولا يعترف بفضله ومقامه الرفيع فى الشعر والحكمة فانه شمس الشرق انارت الشبان.

ولد هذا الشاعر العبقري فى "سيالكوت" سنة ١٨٤٥م فى عشيرة حديثة الاسلام كانوا اجداداه من البراهمة كهنة الهناك اصلهم من اعالي كشمير، اسلموا ونزلوا الى بنجاب توطنوا هناك وحسن اسلامهم ورزقوا خيرا كثيرا افضلها رزقهم بولد كريم صار سببا لبقاء ذكرهم طول الدهر.

نشأ هذا الطفل فى داره ورباه ابواه احسن تربية فكان حسن السريرة والفطنة والذكاء فى صغره مولعا بالصلوة وتلاوة كلام الله تعالى. فلما ترعرع اخذ يتعلم الفارسية والعربية فى داره ثم ارسله ابوه الى مدرسة هناك. فنال شهادة الدراسة الثانوية ثم ذهب الى "لاهور" لينال الدراسة الجامعية. فتعلم و تخرج وعين مدرسا بالكلية يُدرّس الفلسفة وادبى الانكليزى والعربى وبعد سنين عديدة ارسله اخوه الاكبر الى انجلترا فتعلم هناك وفاز بشهادتين عاليتين احديهما الدكتوراة فى الفلسفة (Ph.D.) واخرى المحاماة فى القانون (Bor at Law) وتعلق بجامعة لندرا فكان استاذ العربية بتلك الجامعة.

ولما رجع الى الهند جعل مدينة لاهور مستقره واشتغل بالمحاماة طول عمره ولكنه ما كان اهلا لذلك مع بصيرته فى القانون. لانه كان شاعرا فيلسوفا والشعراء لا يهتمون بامور تهتمها العامة من الرجال. فكان اكبرهمه

يقاظ الشباب وانقاذ الوطن من ايدي الا جانب الانكليز الظالمين.

وكان في بدء امره وطنيا يفضل العاطفة الوطنية على كل العواطف حتى كانه كان يدين بوطنيته. كما تشير اليه اشعاره الا سيما نظمه الذي سماه ”نيا شواله“ اى ”المعبد الجديد“ فصرح فيه انه يحب ذرات رمال وطنه كحبهم آلهتهم. ففي شعره بذلك العصر حرارة لا يستهان بها ولكنها ليست اقصى ما يرام.

فلما نزل بانكلترا و سار في البلاد الاوربية شاهد الحرية الوطنية عن قرب و احس ان لها منافع ومضار و ضررها اكثر من نفعها. فان من يتقلد بالوطنية يجب عليه ان يضحى بكل شى في مصلحة الوطن وارتقائه. فهذا محمود لا ينكر ولكن الوطنى لا يكون وطنيا اذا لا يكون مرماه تخضيع الرجال الذين ليسوا بنى وطنه. لذلك يستمر الجدال والقتال بين بنى آدم اذا هم تقلدوا بالوطنية المحضة فهذا هو الوجدان الذى يقظه واعطاه البصيرة واحس بشعور جديد.

فلما رجع هذا الوطنى الى وطنه العزيز فكان يتصور انه انسان قبل الهندى وان وطنه ليس سيالكورت او لاهور او بنجاب او الهند باجمعها بل الارض بكرتها كلها وطنه. فانشد يقول

چين و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا  
الصين والعرب والهند كلها لنا نحن المسلمون كل الارض وطن لنا  
لانه كان يعلن باسلامه وينادى الشبان ويقودهم الى الحرية الاسلامية لا  
الوطنية وكانو يسبونہ ويغلظون القول ولكنه ما انقاد لهم بعد ما فك عن رقبتہ  
اسر القلادة الوطنية.

لقد يعلمون الذين تفرسوا وتفقهوا في شعره انه ما كان قهقريا ولا ينكر حب الوطن وانه ليس بمتعصب قط. بل انه حر بمعنى الكلمة ويعتقد ان في العيش نصيب لكل بنى آدم اسودها واحمرها، اعرابها واعاجمها. ويعلم ان الامن



العالمى والحرية الكاملة للانسانية باجمعها لا يمكن تصورهما الا فى ظل الاسلام. فجعل المسلم المثل الاعلى للحرية والامن العالمى لان المسلم هو الرجل الذى له يد و لسان لا تؤذى رجلاً آخر.

واذا فهمنا ان الشاعر لا يستعمل الالفاظ فى المعانى اللغوية بل عنده لكل لفظ معنى خاص يريد به. فيسهل ادراك المفهوم على الطالب.

ولهذا الشاعر مصطلحات يذكرها فى شعره مرة بعد اخرى فلنذكر شيئاً منها "مرد مومن" اى "الرجل المؤمن" ففى الظاهر يراد به كل من تقلد بالاسلام و آمن بالله ورسوله ولكن الشاعر يستعير به المثل الاعلى للانسانية لان الذى يسلم حقيقة لا يخضع امام اى شى وينكر السلطة الا سلطان الله الرحمن الرحيم، فلا يعيد الا الى الحق فى كل الامور الدنيوية او الدينية لذلك يخاطب الشباب "بمرد مومن" اى الرجل الصادق الامين الكامل والمثل الاعلى للانسانية.

"عشق" فان لهذا اللفظ ايضا مفهوم خاص فى اصطلاح الشاعر وهو عبارة عن تجاوز ايشوق الحدود لا فى الهوى النفسانية بل فى كل الامور حتى لا يقعد العاشق فوز ولا يطفء نار آماله ببرودة العيش فى اى منزل ولو كان اسمى مما يرام. ولا يفزع ولا يبالى بالا خطار.

بے خطر کو پڑا آتش نرو میں عشق

ولج العشق ناراً اناره نمرود وما فزع

"خودى" "حسن الظن بذاته" فالشعراء والمتصوفون يتصورون ان من يحب يجب عليه ان يفنى بذاته ولا يشعر الا بما هو من عند حبيبه ويستحسنون "بيخودى" اى "نفى الذات" ويزمون "خودى" اى "حسن الظن بذاته" ولكن هذا الشاعر استحسن "خودى" فى شعره وامر الشبان ان يحتفظوا "خودى" فهذا

خلاف لما امرنا القدماء به. فوجب علينا ان ننعم النظر فى مفهوم اللفظ فوجدنا ان الشاعر لا يقصد به حسن الظن بالذات بل يريد به عرفان النفس لان عرفان النفس ضرورى لمن يريد النجاح فى اى امر. فمن لا يعرف نفسه ولا يعتمد عليه لا يتقدم نحو الامام ولو خطوة. ويشير إلى هذا المعنى من عرف نفسه فقد عرف ربه. لان الانسان خليفة الله فى الارض فاذا تدبر فى نفسه يخطو الى الامام وينقاد له الايام ويصدق عليه ”وللاخرة خير لك من الاولى“.

انشد هذا الشاعر الحكيم والفيلسوف الكريم بلسانين. الاردوية والفارسية وله دواوين شعر عذب حار فى اللغتين.

فاربعة مجلدات منها فى الاردوية- اولها ”بانك درا“ اى ”نداء الرحيل“ ثانيها ”بال جبريل“ اى ريشة جبريل، ثالثها ”ضرب كلیم“ ورابعها ”ارمغان حجاز“ اى ”الهدية الحجازية“ وهذا المجلد الاخير يتضمن قسمين: قسم فى الاردوية وقسم فى الفارسية.

وفى الفارسية ١- اسرارخودى ورموز بخودى، ٢- پیام مشرق، ٣- زبور عجم، ٤- جاويدنامه، ٥- مسافروپس چ بايد کرا توام مشرق-.

وماعدا هذه المجلدات له مقالات و محاضرات فى اللغة الانكليزية تفسر بما عنده من الحكمة البالغة.

عاش هذا الشاعر ثلث و ستون سنة وانتقل الى رحمة ربه فى سنة ١٩٣٨م و دفن فى لاهور بخارج الجامع السلطاني يغفر الله له ونور مرقده ويسكنه فسيح جنته.



## آخر ملوك الهند

ولد هذا المسكين فى قصر ملكى عامر المشهور ”بلال قلعه“ اى ”الحصن الاحمر“ سنة ١٤٤٥ م وسمى بسراج الدين ونشأ فى الحصن وتعلم وتادب حتى نبغ فى العلوم والاداب وتمرن الفنون الحربية ومهر فيه كعادة ابناء الملوك فى عصره.

كان لسراج الدين اسمى مقام فى العلم حتى يقال انه ما ولد فى البيت الملكى اعلم منه بعد جدجده محى الدين الشهير ”باورنگ زيب“ الملقب ”بعالم كير“ رحمه الله. وكان عالما خبيراً وقادراً حسن السريرة عالى الهمة ولكن الاقدار لم تسمح له ان يستفيد من علمه ومهارته ويخدم الدولة والوطن. لان اباه الملك مازال حياً وما اتاه العرش الا بعد ان شب شعره ضعفت قواه وغارت همته.

ما كانت الدولة المغلية فى آخرايا مها الا عبارة عن عرش و حصن وراتب شهرية من شركة شرق الهند (E.I.Co.) والاقتدار والسلطان حتى حوالى العاصمة دهلى كان للشركة نفسها فكانت هى الآمرة الناهية فى الحقيقة. فما كان يقدر صاحب الجلالة ملك الهند ان يتخذاً حداً من ابناءه ويجعله ولى عهده الا بعد ما اجازته الشركة الخبيثة فيعين جلاله ظل الله الملك باشاراتها.

فلما تمكن سراج الدين على العرش ولقب ب بهادر شاه اى الملك الشجاع ما كان يستطيع ان ينجلى عنه وعن الوطن فما كان عنده جيش ولا

مال ولا شباب فاستغنى باسمه عن عزائمه وجلس على عرش المملكة كأنه ناسك فقير معتكف في كهفه على راسه طاقية ويده سبحة بدلا عن التاج والسيف.

كان هذا الملك العالم مولعاً بالشعر فكان يقضى ايامه بالانشاد والغناء. فجمع في قصره الشعراء بدلا عن الابطال والعسكريين فكانوا يمدحونه و ينشدون القصائد ويرجعون بالجوائز. والملك ايضا ينشد الاشعار اكثرها في الغزل (و هذا نوع من أنواع الشعر الرائق) والتصوف.

وكان هذا الملك الملقب ببهادر شاه ياتي في شعره باسم صغير كعادة الشعراء (يصطلحون هذا الاسم الصغير بتخلص) هو ”ظفر“ ولا له الا الياس والخيبة، فيا عجباً بتخليصه ظفراً. هنالك اتذكر قول ابي الطيب في زنجي ليلى اللون يسمى كافوراً. فما اطيب ما قال ”وبضدها تتبين الاشياء“.

فلما ثارت الهند باجمعها ضد الانكليز سنة ١٨٥٧م كان هذا المسكين في حصنه مضطرباً قلقاً الا يدري ماذا يفعل هل يخرج الى الساحة ويقود الشعب ليعطى الوطن حريته او يموت في سبيله ام يقعد ينتظر قضاء الله. حتى قامت الثورة واجتمع الاحرار امام الباب العالي فثار ثأره وامر قواده ان يقودوا الاحرار و يقاتلو الفرنجيين الفجرة.

ولكن الفوز ماتيسر للاحرار لاسباب منها: غدر المقربين وانشقاق القائدين وعدم نظم العسكريين فهزم الجمع وولوا الدبر فدخل القصر وحضر بين يدي الملك صهره واكبر وزرائه وحضه على رفض الاحرار بقاء لحياته وصوناً لعرشه كما هو. فاستسلم الامر اليه.

خرج الملك المسكين مع عشيرته من الحصن الاحمر لما اشار اليه صهره و نزل خارج المدينة بمقبرة جده همايون ودخلت العساكر الانكليزية

عاصمة الهند فقتلوا الاهالى ونهبوا اموالهم وخربوا العمران وحاصروا المقبرة التى نزل فيها الملك وابنائهم وعشيرته.

فلما استولت القوات الاجنبية المشؤمه على العاصمة واخذوا يقتلون و ينهبون و يذبحون اطفالا صغاراً حضر قائد الجيش الوطنى بخت خان فى المقبرة بين يدي الملك واخبره بما يفعله الانكليز الخائنون وقال انهم الغادرون فيجب علينا ان نرحل الى الجبال ونتخذها ماوى لنا وبعد ما نتمكن نكر الى القتال ونفوز ان شاء الله تعالى. فان العاصمة ليست بمملكة فان هزمنا عنها لا يلزم ان نترك القتال ونستسلم نفوسنا بايدي الظالمين اعدائنا اعداء الوطن والحرية. فهيا بنا فقد تجتمع الامة حول ملكها حين ايقنت بنجاحه.

فنظر الملك المسكين الى اقرب المقربين واستشاره فاعده بالهلاك اذا فر مع القائد الحر الباسل وذكر وعود الانكليز بان عرشه سيعود اليه وراتب لا ينقطع وانه سيعيش عيشة راضية.

فرفض الملك اقتراح القائد بخت خان وامتنع عن الفرار معه وقال رضىت بالقضاء فانج انت بنفسك فاذا نجحت آمالك كنت معك. فقال بخت خان اذا انت لا تذهب معى فارسل معى ابناءك وولى عهدك لتجتمع الامة حولهم فرفض هذا الاقتراح ايضا. فبكى بخت خان وانصرف الى جهة لا يعلمها الا الله. وبعد ما ايقن الانكليز بهزيمة الارباب الوطنيين دخل المقبرة قائد الجيش مع الجنديين وقبض على الملك وابنائهم وعشيرته وساقوهم مسجونين فندم على البقاء ورفض اقتراح القائد الوفى المخلص ولكن لم تنفع له الندامة. والملاعنة ذبحوا الامراء الشبان وقطعوا رؤوسهم واتوا بها الى المسكين فى طسوت مغطاة كانه الطعام. فلما كشف الغطاء ورأى افلاذ كبده ابتسم وقال هكذا يموتون الارباب المغلون.

ساقوه الى محكمة خاصة للحكم عليه. واثبتوا انه غدارا كبر وما كانت ثورة  
الاحرار الا باشارته وطوعا لا وامره واستشهدوا على قولهم بفراره من الحصن  
بعد هزيمة الاحرار مع انه كان هذا الامر باشارتهم وكانوا وعدوه انهم يعيدونه  
فى الحصن واخيرا حكم عليه بالحبس طول حياته وانجلائه من الهند فذهبوا به  
اسيراً الى برما وسجنوه هناك فى سجن خصوصى انتقل منه الى رحمته الله  
تعالى سنة ١٨٦٢م.

ومن آثاره رحمه الله ”كوشك محل“ فى الحصن الاحمر على حصاره  
الشرقى كان يجلس فيه يشاهد منظر النهر ”جمنا“ وله اثر حى وهو ديوان شعر  
رائق عذب لا يبلى ولا يمزقه مرور الايام لان فيه روح وجدانه.



## شاعر النار والد مار

بلاد الهند تسمى شبه القارة وهي واسعة جداً تمتاز ولاياتها بالطبيعة المختلفة. ففيها جبال شاهقة و ميادين واسعة وانها رجاوية ورماد متراكمة. ولكن كل هذا الاختلاف الطبيعي لا يعادل حقيقة باختلاف السن اهلها القاطنين في انحاء البلاد.

لا يمكن لاحد ان يسير في البلاد الهندية ولا يدهش من مناظرها الطبيعية ولا يتعجب على اوضاع الهنود والسنهم المختلفة فانه اذا ما دخل ولاية يحسب انه نازل ببلاد اجنبية فاذا كانت الولاية التي مربها هي الهند فما هي التي دخلها؟ فيشوش ادراكه ويسأل عن نفسه اين الهند وكلها هند باجمعها. اللغات الهندية عديدة يستعملها العامة. ينطقون بها وينشدون الاشعار فيها. ولكن اغنى اللغات الهندية واحلها ادبا منها لغتين ”البنغالية والاردوية“. تمتاز ادبهما بالأنواع والاساليب الادبية.

فالاردوية لسان مخلوط جديد ليس لها منطقة مخصوصة كسائر اللغات الهندية. يستعملها الاهالي في كل مقاطع الهندية. والبنغالية يستعملها الذين يسكنون في ”بنغالة“ وهي ولاية في شرق الهند، كثيرة المياه والغابات، ذات مناظر جميلة وهواء غليل. اهلها مشغوفون بالغناء والرقص واكثرهم الفقراء والمساكين.

فادب البنغالية يمتاز باداب اللغات الهندية بعدوبته. لما فيه روح مناظر البنغالة

ووجدان ان اهاليها المساكين. فانهم يرقصون ويغنون وحياتهم كلها التعب والمصائب. وكأنهم يعتقدون بالعيش الروحاني. وينشدون بالحب والعزم بدلا عن العويل والبكاء ولوجدانهم هذا يد بيضاء لشعرائهم المتصوفين الذين يحرضون على الحياة الروحانية ويمثلون الحب فوق كل شئ حتى العمل للعيش والفوز في حياتهم العملية.

ولد في هذه المنطقة (بنغاله) طفل في عائلة مسلمة فقيرة خاملة الذكر. فما تيسر له ان يتعلم ويترقى المدارج العلمية. فقرأ القرآن وشيأ يسيراً من الفارسية وتمرن الالحن الموسيقية كعادة البنغالين المشغوفين بالرقص والغناء. ولكن الاقدار ما سمحته ان يمهر في العلوم او ينيع في الموسيقى لان اباه كان فلاحاً بالسوا يشتغل اجيراً باراضى ذوى العقارات. فاشتغل الابن المسكين بالفلاحة مع ابيه.

ولما كان هذا الولد المسكين "نذر الاسلام" ابن ثمانية عشر اذ نشبت نار الحرب العالمية الاولى. فتعلق بالجيش جندياً تقلد السيف وانتقل مع جيشه من الحقول الخضرة الى ساحات القتال ورموه الانكليز في العراق حيث كان معسكرهم. ذات ليلة دق جرس الخطر. فهرب الجميع الى خنادق. وهجمت طيارات الاتحاديين وقذفت القنابل. فقامت القيامة في الجند البريطاني. فما كان احداً من على نفسه حتى في الخنادق العميقة المظلمة. فكانوا بين قتلى وجريح، والفضاء كلها صراخ وعويل، ولكنه كان بينهم جندي لا يبالي بالخطر المحقق وكان في يده قرطاس وقلم الرصاص يرقص عليه والظلام مخيم. وما كان يشعر هذا الجندي بما هو كاتب فلما اصبح دهش حين رأى القرطاس مكتوباً فيه قطعة اشعار حماسية بديعة. فما كان يصدق نفسه لانه مانشد الا شعار قط وما كان شاعراً من قبل.



هكذا كان بدء الامر فصار الجندى المسكين الغريب شاعراً عبقرياً فلما  
رجع الى ام راسه بعد الهدنة فكان عليه لباس الجندى الرسمى وفى جيبه  
قراطيس مكتوبة فيها اشعار حماسية ما سمعتها الأذان مثلها فى البنعالية قط.  
فشعره يختلف باشعار شعراء البنعالية تماماً وله اسلوب غير الاساليب المعتارة  
وروح جديد يسرى فى معانيه.

نشرت الجرائد شعره الحار. ثم الفت منه صحيفة صغيرة سماها الشاعر  
”اكنى وينا“ (اى النفير النارى) وكان فيها شعره الذى انشده فى ارض العراق  
الحامية وهو جندى فى المعسكر البريطانى يرجوه نهوض المسلمين وفوزهم  
وهزيمة الطاغين. فاغتاض الحكومة وحدوده الحاكمون وامرو اباصراق النفير  
النارى وحرم الشاعر من راتبه فكان الشاعر فى ضيق شديد ثابتا فى جاشه لانه  
كان عالماً بهذا الجراء من قبل الحكومة الطاغية الملعونه.

ماكان يخطر بباله هجوم الادباء والشعراء عليه والشاعر الفيلسوف ”تيغور“  
يرأسهم. ولكن شعره النارى وموسيقيته الحار اخذ يتزعزع قصر الادب  
البنغالى لانه يوقض البائسين النائمين ويوقد نار الحياة فى قلوبهم. وكانوا  
يعتقدون بحياة روحانية وينشدون الاغاريذ الغرامية بالحن مسكرة فقاموا  
باجمعهم ورموه بالبدعة الادبية.

قامت الحرب الادبية بين هؤلاء وبين شاعر النار والدمار فكان قلقاً ولكن  
الاديب والزعيم الشهير البطل ”جترنجن داس“ نصره وكان ينشر اشعاره فى  
جريدته ”المقدام“ لولاه لما فاز الشاعر عليهم اجمعين.

ولما ذاع شعره وقرأوه الاهالى استحسوه لانهم وجدوا فيه وجدان الحقيقة  
الثابة وروحا حماسياً يرشدهم الى الامام ويمثل لهم الحياة كما هى. ويدعوهم  
الى الثورة ضد الظالمين الذين يعيشون عيشة راضية بغير عمل ما والذين

يجهدون لا تاتيهم الا كسيرات من رغيث يابس لا يالفها كلاب الخائنين .  
انشد هذا الشاعر ابياتا وسماها ”دروهي“ (اي الثائر) فتعلقت الابيات  
بقلوب الاهالى فلقبوه ”دروهي كوي“ (اي شاعر الثورة) واعجب بها كبار  
العلماء والادباء فى عصره. فكتب الاستاذ ”سركار“ ما معناه:  
”لما قرأت هذه الابيات (دروهي) شعرت بان الثورة التى كنا ننتظرها منذ اعوام  
طوال قد لاحت بشائرها وان سيلا من شعور الحياة يهيج فى ادبنا. كنا نحسب  
ان المسلمين البنغاليين ما التفتوا الى لسانهم الوطنى التفاتاً تاماً. ولكن ايقظ  
الروح الوطنى قد بدأ بايديهم ولهم الفضل ثابت فى هذا الامر“.  
ولهذا الشاعر فضل آخر ليس لاحد سواه وهو انه الشاعر البنغالى الوحيد سجنه  
الا نكليز مراراً جزءاً لحريته وامتنعوا الناس عن شعره واتلفوا عدة مجلدات منه.  
كان هذا الشاعر فى بدء الامر يخاطب شباب المسلمين ويحضهم على  
النهوض وقيامهم امام الظالمين واستيصالهم وانقاذ الوطن من ايدى الخائنين.  
ولكنه بعد زمن قليل احس ان المظلومين ليسوا ابناء دينه فقط فتخصيصهم  
بالخطاب لا يفيد لان الظلم لا يفنى ولو امن المسلمون منه. فكان ينادى  
الشبان المظلومين ايما كانوا واينما وجدوا.  
فهذا الشاعر يستحق ان يرى فضله ويستعظمه الجميع.  
وبشعر هذا الشاعر صار الادب البنغالية يمثل الهند باجمعها لانه هو الادب  
الجامع بين الجمال والجلال المتباينين كجبال الهند الشاهقه وميادينها  
الواسعة وانهارها الجارية ورمادها المتراكمة.



## البطش والرّحمه

يفتخرون الملوك على سلطانهم ويظلمون الناس ويختلسون اموالهم و  
انفسهم كيف ماشاؤا ولا يقدر احدٌ على ان يتاوه جهاراً خوفاً منهم. ولكن  
شهدت الهند ملوكا مسلمين الصفوا ورحموا على الضعفاء والمساكين وهم  
الذين عمرو البلاد واسسوا الدولة حقيقة.

انى احدثكم عن ملك ذى باس شديد، كان يخفق بين جنبه قلب حنون  
رحيم. وهو الملك الشجاع المقدام مؤسس الدولة المغلية فى الهند الغنية  
صاحب الجلالة الملك بابر المغفور له- لا ينكر لسالته ويقسم بحدة سيفه  
الشجعان لكنه مع بطشه كان رحيمًا بمعنى الكلمة.

ما هذا قولى فقط بل سجله التاريخ باحرف من نور  
كانت دهلى عاصمة الهند من اقدم الزمان وكانت مدينةً عامرةً مثل سائر  
المدن العامرة الغنية. فاسواقها مملوءة وشوارعها مزدحمة من المارين. رجالا  
ونساءً شيوخاً وشباناً وصبياناً واطفالاً. اذعلا الغوغاء واضطرب الجميع واخذوا  
يهربون الى حيثما توجهوا خوفاً من الموت لا يفوتهم اذا دسهم فيل عاصى  
مجنون.

الناس كانوا يمرون والفيل بعد و غضباناً- ياخذ هذا بخرطومه ويدس ذلك  
برجله والفضاء كلها صياح وعويد. وكانت فى السوق امرأة منبوذة تحمل فوق  
راسها سلة فيها طفل صغير. اذ دنى الفيل من تلك الامراة المنبوذة فقفزت المرأة

وهربت لا تدري الانفسها. والطفل قد هوى من السلة والفيل تقدم نحو الطفل الصغير. والجمع ينظرون متأسفين منتظرين قضاء الله. اذهرع رجل نحو الطفل والتقطه وانقذه فغضب الفيل على هذا الرجل ومد اليه خرطوم الطويل ليقبض عليه ويسقيه مرارة غيظه جزاءً على رحمته على الطفل الصغير المسكين.

والرجل قد فر من امام الفيل كانه حية تسعى او نسمة ريح عاصف ولكن خرطوم الفيل اصاب برأسه فهوت عمامة الرجل ولكنه نجى والطفل معه- وتوجه الرجل مسرعاً نحو المرأة المنبوذة حتى وافاها وقدم اليها طفلها وقال خذيه وقر عيناً.

فابتهجت المرأة واخذت تقبل طفلها وتدعو للرجل الرحيم. اذ اقبل رجل آخر وهو ملتف ببردة فكشف عن وجهه ويديه اذا في يمينه خنجر فرمى الخنجر وقال ايها الملك الشجاع المقدام كنت آليت ان افتك بك وكنت افتقدك منذ زمان وانتظر الوقت حتى رائيتك تقطف الطفل من مخالب الموت. وعرفتك حينما طارت عمامتك وتجلي آثار الجروح في رأسك ولكنى بعد الآن لا اقدر ان افتك برجل كريم صاحب قلب حنون رحيم. فاقبض على وأمر بقتلى جزاءً سوء نيتى بك.

فتبسم صاحب الجلالة الملك بابر وقال لا اظلم على احد ولا آمر بالقتل جزاءً على سوء النيات. فاني عفوت عنك وأمر لك بوظيفة فى عسكرى. هكذا كان شان المملوك فكانوا شجعانا مقداما ذوى باس ويطش وفي جنوبهم قلوب مملوءة رحمة وحنان كانوا يفتشون عن احوال الشعب ويشاهدون العامة من بينهم ثم يحكمون ويجيزون.



# تذكار الوداد

(مدينة حيدرآباد)

سمعت ان زائرين متعابين نزلا بالهند ومرا بمدينة آكره فلما دخلا حديقة  
”تاج“ دهشا من منظرها وقالت جميبة لصاحبها وحبيها ”لوانى أتيقن انك  
تبني على مرقدى بناية كالتاج لمت فى الحال بكل سرور“.  
انما هذا كلام لا ريب فيه. فان فى تذكار الحب حيات فوق الحيات  
لاموت لها الى الابد.

بلاد الشرق تمتاز بعواطف الحب والغرام والوفاء والاخلاص فليس  
”التاج“ وحيداً الا ترى الى نجد تحكى تلالها وبقاعها ”بقيس وليلى“ والى  
”بى ستون“ فان آثار الديار تحدثك ”بشيرين وفرهاد“ والى منازل اخرى  
تذكر بفلان وفلانة.

والبلاد الهندية معمورة بالحب والغرام. منها ماتشاهد آثارها ومنها ماتسمع  
حديثها وقلبك يخفق اعجابا بهم وترفع قبعتك احتراماً لهم.  
وها أنا انقل رواية عن افواه الرجال تشبه رواية تاريخية وهى رواية غرامية  
تحكى عن اخلاص ووفاء بين متحابين صدق عليها الشعر  
نظرة فابتسامة فسلام فكلام فموعد فلقاء  
عشقا وافقهما الاقدار فعاشا فى ظل الحب وتركوا آثار ودادهما فى  
حيدرآباد وهى ايضا منها.

لما انقرضت الدولة البهمنية تولدت منها دول صغرى. فكل ولاية صارت دولة مستقلة - فدولة "كولكنده" عبارة عن حصن حصين فوق الجبل وقرى وامصار حوله. فكان الحصن عاصمة الدولة ومستقر سلطانها. وما كانت هذه المدينة الكبيرة المعمورة اعنى حيدرآباد الا الحقول والمرعى للدواب او الغابات تسكنها الوحوش فى الاكثر وينزل الملك والامراء اليها للصيد والقنص وتنزه على شط النهر "موسى" ويعودون الى الحصن ويعيشون فى قصورهم فى ارغد عيش.

كانت على شط النهر "موسى" قرية صغيرة تسمى ججلم - تشمل على اكواخ اكثرها من اوراق الاشجار واغصانها. يقيمون فيها اناس من الهنادك اكثرهم الفقراء ليس لهم نصيب من الثروة والغنى فكانوا يعيشون فى عسرو كانت نساؤهم راقصات مغنيات. ياتون اليهن الرجال ذوى الجاه والثروة ويلهون ويتفرجون بهن. فكان الرقص والغنا معيشتهم. والذين لهم معيشة كهذه المعيشة لاتكون لهم منزلة عند ذوى الاسباب والجاه ولكن عين الحب لا يلتفت الا الى ماتشتهيه الا نفس والمحبون ينظرون بغير ابصار العقلاء.

كانت فى هذه القرية (ججلم) راقصة فتاة ذات جمال وكمال اسمها "بهاك متى". خرج الامير محمد قلى ذات يوم للصيد كعادة الامراء. فلما عبر النهر "موسى" قاصدا الغابة اذ بفتاة ذات جمال مدهش ودلال راجعة الى كوخها. تحمل على راسها جرة مملوءة من الماء وتمشى على استحياء تنها لك فى مشيها. فلما دنت من مركبه نظرا كلاهما الى الآخر وسهم العشق سبق نظرهما. فنزل الامير من فرسه ومشى خلفها الى كوخها معجبا بجمالها مزهولا غائبا عن صوابه. حتى دخلت الكوخ واكرمت بالامير فازداد عجبه من ادبها وحسن كلامها ورجع الامير الصياد الى قصره فى الحصن وقد صيد قلبه.

اخذ الامير محمد قلى ينزل من حصنه كل يوم كانه يقصد الغابة للصيد

ولكنه بعد ذلك اليوم ما كان يعبر النهر الا ليزورها ويجلس معها ويفرج  
نفسها بحديثها وغنائها. فتعلق روح كل منهما وتحابا ووقعا فى شرك العشق  
لا انفصام لها وتعاقدا ان لا يفوتهما يوم بغير لقائهما.

فذاث يوم كان الامير يريد النزول الى ”ججلم“ اذا مطر السماء واشتد  
المطر حتى المساء. فلما غربت الشمس اضطرب الامير اشد الاضطراب لانه  
قضى يومه بغير لقاء ”بهاگ متى“ فخرج من الحصن على فرسه قاصدا قرية  
”ججلم“ والليل دهماء والسحاب ماطر.

فلما وصل على الشط وقف جواده ولم يتقدم نحو الامام لان النهر كان  
هائجا ولا يسمح احداً للعبور. فنظر الامير نحو القرية فلمح على شط آخر نوراً  
ينبعث من السراج فايقن ان حبيبته الوفية يقظانة وانها انارت السراج ليهدى  
اليه ضالها الذى لم ينجز بوعدده وتاخر عن الزيارة حتى سبقه الليل. فركض  
جواده والقاه فى الامواج المتراكمة وعبر النهر ولم يفزعه خطر الموت غريقاً.  
اخبر الجواسيس الملك ان الامير ولى عهده خرج من الحصن فى مثل  
هذا الفضاء وعبر النهر وهو هائج وذهب الى ججلم زائراً فتاة رقاصة فاجرة.  
غضب الملك ولكنه امسك بغضبه وامر المهندسين ان يبنى جسر على النهر  
ليسهل العبور لمن يمر لاسيما اذا كان النهر هائجا. فهذا الجسر ”پران پل“  
اى ”الجسر العتيق“ اول بناء شيدوه خارج الحصن وايضا اول شاهد على  
عشق الامير ”محمد قلى“ والراقصة الفتاة ”بهاگ متى“.

ولما رجع الامير الى الحصن وحضر بين يدى ابيه الملك ضجره  
الملك وامره ان لا يزور فتاة فاجرة هلو كا عاهرة ولكن سلطان العشق امره  
بغير ما امره ابوه الملك فجمع بين الامرين واخذ يدعوها فى قصره على حين  
غفلة من ابيه. حتى وافقه الاقدار ومات ابوه وخلفه من بعده.

صار الامير ملكا وجلس على عرش الدولة ولكنه مانسى ذلك الوداد و  
تلك الوعود فطلبها فى قصره الملكى الجديد ليجعلها ملكة فاقترحت عليه  
ان يبنى تذكاراً لعشقهما. فامر السلطان محمد قلى ملك ”گولكنڈه“ ان تعمّر  
مدينة جديدة على شط النهر ”موسى“ وسمى المدينة ”بهاك نگر“ نسبة الى  
عشيقته الوفية.

بنيت القصور والمنازل ورفع الحصار حول المدينة وعمرت المدينة  
فجعلها عاصمة الدولة وبنى فى وسط المدينة بناية مربعة الشكل فى كل ركن  
منها منارة عالية. وتفننوا فى بنائها وشيدواها بالجص والآجر وسمى البناية ”چار  
مينار“ اى ”المنارات الاربعة“

يقال ان هذه البناية المربعة ذات منارات اربعة عالية بنيت بمكان كان  
كوخ ”بهاگ متى“ فيه. وعلى سقف البناية معابد. وفى الشرق منها مسجد  
وفى الركن الشرقى الجنوبى معبد للهناذك الوثنيين. كان البناء اشار بهذا الى  
المتحابين المتقلدين جديتين مختلفين.

”بهاگ متى“ اسلمت بعد ماصارت ملكة ولقبها الملك محمد قلى ب  
”حيدر محل“ فتغير اسم المدينة مع من انتسبت اليها. فان ”بهاگ متى“  
لقت حيدر محل و مدينة بهاگ نگر اشتهرت بحيدرآباد. فليقال ان  
حيدرآباد هى فى الحقيقة تذكار الوداد.





## الرتاء فى الأردوة

يمتاز الانسان بين ابناء جنسه بل فى المخلوقات كلها بعوا طفه التى هذبته وأسست المدنية والحضارة. لولاها لما عمرت الارض ولا ارتقت الحياة وبقيت شعابا و غابات تسكنها الوحوش الضارية ولو كان الامر كما كان قبل استيلاء الانسان على الارض لما وجدت فيها الا جثثا رامدةً ولكنه لما هبط آدم وكثر ولده الذين كانوا يميلون بعضهم إلى بعض ويعيشون حيات اجتماعية فقد نمت شجرة الحياة ومد ظله على العالم كله فعمرت الارض وصارت مدنا وامصارا يسكنها ذو قلب حنون.

فاذا ثبت ان الانسان هو الذى عمر الارض و ارفع الحياة الى منزلتها العليا فيلزم انه ما تيسر له هذا الفوز المبين الا بتقليده الحياة الاجتماعية التى دعت اليها عواطفه الميالة الى مثله فى الانسانية ولذلك يقال ان اصل الانسان الانس وبه صار الحيوان الماشى على قدميه انسانا.

اننا اذا امعنا النظر فى الانسان نفسه لوجدناه اقوى على كل صعب يحتمله ويستقبل الامور الهامة على الهمة ضابطاً مجتهدا وضاح الجبين باسماء فى كل حال ولكن ينفد صبره متى ما فجع بفقد انيسه. فباءن ويبكى وينتحب ويسيل من مقلته سيل العبرات كأنه بحر مواج لا يسده شىء.

انما هو مضطر على البكاء فى ذلك الحين. الا ترى اصبر الصابرين وهو خاتم النبيين ﷺ وعلى اله وصحبه اجمعين لما مات ولده فابتلت لحيته من

الدموع المنحدرة المتساكبتة وهو يقول ”عين تدمع والقلب صابر على قضاء الله وبلاءه“ فان بكاء المفجع اذا كان ضد الصبر لما ابتلت لحيته.

إن الانسان إذا ما فجع يضطر الى البكاء والالين. فالوجع الممتلى قلب المضطر اذا تجاوز اللسان والدموع اذا ما انتظمت فى سلسلة مترنمة والالين لبس حلية الالفاظ فهو الشعر الرثائي. يظهر تاثر الفجيع وعطفه على الفقيد ولحنه الحنون يمثل تجاوب اظار على ربع ردى.

والشعر الرثائي يوجد فى كل ادب من الآداب لانه ما وجد فى المجتمع الانسانى فرد واحد لا ياتيه الاجل ولا يموت ويعيش ابوالدهر فيرتحل كل انسان متى يوافيه اجله ويترك الدنيا وما فيها من بيت ومال وانيس قريب لا يلتفت الى شئ منها. فلا يستوقفه بكاء الباقيات ولا عويل الفجيع. وكل من يعيش على الارض مصاب بموت اخيه وبنة وابيه. فيحس بالم شديد يوذيه ويضطرب فى عمره الطويل ويضطر الى بكاء وعويل فيتاء وه والدموع من عينيه تسيل.

الادب العربى من اغنى اللغات فى الرثاء والتابين. لان العرب كانوا احوج الناس الى بعضهم. فكان كل واحد منهم كيد تحمى عن الجسد كله. فكانوا كسلسلة اذا انفك منها حلقة نقصت السلسلة وانتشرت الحلقات المتكسرة فتان كل منها. فالمصاب باخيه ان ابنه او باحد من الاقرباء كان يفجع شديدا او يحسب حياته اصعب بعد الذى ارتحل فيضطرب ويتاوه ويأن ويرثى فقيده كل حين فكثرت المراثى وعدت من ارقى اصناف الشعرا العربى لا يعادله فى كثرة العدد الا الشعر الحاسى.

اذا طالعت المختارات من الشعر الماثور شاهدت انه لا يوجد شاعر الا هو يرثى ولو ما كان من الاخصايين فى الرثاء كبعضهم تراسهم تماضر فانها بذلت قريحتها فى رثاء اخويه. فيندر بين الشعراء من لا يفوه بشعر رثائي قط

ولشغفهم فى هذا الباب قد اهتموا بوضع العيار للمرثية كما وضع اعياراً لسائر اصناف الادب ليظهر الغث من الثمين ويمتاز الجيد من الفاسد.

فيجب على الشاعر ان لا يبالغ فى الوصف. لان المبالغة عيب لاسيما فى الرثاء فلا يسب التحسرو والبكاء الى غير من يكون اهلا بذلك. فبكاء الدواب او الجماد كالبيت والسيف مستحيد فاذا يحكى الشاعر عن هولاء انها تبكى لا يصدق السامع فيفوت غرض الرثاء ومن يريد عيار الرثاء مفصلاً فيراجع مطولات الفن.

وما عدا تلك المحاسن والاضداد التى بينوها علماء النقد الادبى انى وفقت بعيارين آخرين. فالاول منهما انه يجب ان تكون بين المفجع والفقيد نسبة قريبة لان الالم المحضى على الرثاء لا يمكن وجوده لغير قريب قط فالرثاء بدون جرح فى اعماق القلب حكاية عن غير الحقيقة. والاخر ان لا يمر الزمان على الفجعة فيحول بينها وبين المرثية لان مرور الايام تداوى الكلام وتنقص فى شدة الألم.

لقد انكشف على هذا الامر حينما كنت اطالع ديوان الخنساء وترجمتها فلما قرأت انها لقيت امير المؤمنين عمر الفاروق رضى الله عنه فنهاها عن الرثاء فقالت له او كنت انت المصاب لما قلت ما قلت. فادركت انها صدقا. عدم النسبة القريبة بين صخرو وبين الفاروق اعجبه وتلك النسبة بينه وبين اخته تماضر حضتها على الرثاء فحصل لى العيار الاول.

ولما قرأت انه قيل لها. اترثين وقد اسلمت وهجرت الجاهلية الاولى فقالت كنت ابكى له من الثأرو انا اليوم ابكى له من النار فادركت من السؤال والجواب عنه ان مرور الليالى والايام ينقص ويضعف الآلام. فاخذت هذا الامر ايضا كعيار لنقد المرثية.

الاردوية من اغنى اللغات الهندية اذ با، مخزائن الكتب مملوءة من الكتب القيمة فى النشر والشعر باصنافهما. وهذا الادب يفوق الآداب لا فى عدده فقط بل فى رقة المعانى وبداعة الاسلوب لا يعادله ادب من الآداب فى اى لغة هندية. ماتيسر لنا ان نعلم كيف كان هذا الادب فى بدءه لان الكتب القديمة قد غابت عن الانظار وضاعت حتى لا نعلم شيئاً ولا اسماءها تماماً. ولكن المكتشفين اكتشفوا بعض الكتب التى صنفت وكتبت فى الولاية الدكنية اى الجنوبية فانها اقدم الكتب عثرنا عليها.

تلك الكتب القديمة ترنا ان الادب كان رائقاً فى عصره القديم وشعراء العصر الغابر كانوا ينظمون الاشعار فى كل صنف من اصناف الشعر. فنجد فيها القصيدة والرابعى والمثنوى والغزل والمرثية وغيرها وكلها مدخرفى دواوين الشعراء.

انتشرت الاردوية فى انحاء البلاد وصفت اداها فتعددت الاساليب وابدع الشعراء وتفننوا فى القوالب وبضهم اختصوا نفوسهم بصنف من اصناف الشعر واشتهروا به. كشاعر القصيدة او شاعر الرابعى او شاعر المرثية وغيرها.

نجد المراثى كثيرة فى هذا الادب ولكن اكثر الناس لا يعرفون باسم المرثية الا الهاشميات. لان اكثر الشعراء ما يرثون الا حسينا ورفقاءه المظلومين فظنوا انها مختصة بهم. ويندر بين الشعراء من يرثى احداً غيرهم. وذلك لانهم يعتقدون انهم اذا تباكوا على الذين قتلوا ظلماً فيغفر الله لهم ذنوبهم ما تقدم منها وما تاخر ويعطى لهم اجر عظيم.

ان الذين اختصوا نفوسهم بالمرثية جعلوها مسدسيتها القلب وتفننوا فيها فنجد فيها الشعراء الربيعى الرقيق العذب وكثيراً ما يبدو به ويسمونه "چهره" اى اتوجه وذلك بمنزلة التشبيب من القصيدة.

قال ارثى الشعراء الهنود فى مرثية هى تعد من حسن راثية وهو مير ببر على الشهير بانيس . لقد اتفق الناقدون على تقدمه فى هذا الباب .

پھولاشفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح      گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح  
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح      سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح  
تھا چرخ اخضرى پہ یہ رنگ آفتاب کا  
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

”احمر الافق الشرقى حينما ازهرت حديقة الصباح يلبست واصفرت  
روضة الليل واقبل ربيع النهار وجعل السماء تفدى بالنجوم على الفجر الطالع  
والعابدون توجهوا الى ذكر الله سبحانه وتعالى كانت الشمس الطالعة على  
السماء المخضرة كانها زهر ورد يبسم فى الحديقة“.

فمثل هذه الاشعار كلها بديعة عذبة ولكنها اشعار ربعية وياتون بعد الوجه  
”بالرزم“ اى المقاتلة وهذه الاشعار الرزمية تختلف من اشعار حماسية عربية  
لان الشعراء الهنود يذكرون فيها الآلات الحربية كالسيف والرمح والقوس  
وغيرها ويصفونها وصفا بالغابده عن الحماسة والفروسية . كما قال الشاعر  
فى هذا المعنى .

نیزہ ہلا کے جانب قاسم بڑھا وہ یل      دولہا نے مسکرا کے صدادی سنبھل سنبھل  
گھوڑانہ گر پڑے ترے لنگر سے منہ کے بل      تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل  
ضیغم ہیں پیشہ اسد ذوالجلال کے  
کیجو سناں کے وار ذرا دیکھ بھال کے

البطل القوى هز رمحه وتقدم نحو قاسم بن حسن بن على رضى الله عنهم  
فناداه العريس (اى القاسم يزعمون انه تزوج مع بنت عمه ليلة قبل المصاف  
لذلك يلقبونه ”دولها“ العريس) مبتسما وقال اعتدل واحذر ان لا يقع

فرسك على الارض لعدم تقويمك عليه. انما انت راكب على الفرس  
واجلك على عنقك نحن اشبال اسد الله ذى الجلال قاطعن بالحدز التام.  
وبعد الرزم يرثون ويتظاهرون بالبكاء والعويل ويسمون هذا الدور من  
المرثية ”بين“ اى البكاء والعويل ولكنها فى الاكثر تخلو عن التأبين والتحسر  
لان الشعراء لا يتبعون القوانين الادبية وما يحكون الا كما يشاؤون ليس كما هو  
فيخلو شعرهم من تأثير الكلام لذلك يضطرون الى تصريح القول ”مؤمنين  
مقام كريمة“ اى ايها المومنون هذا المقام يليق ان تبكو فيصرخون السالعون و  
يتظاهرون بالبكاء وعيونهم لا تسغى ولا بدمعة.

فاذا امعنا النظر فى هذا الصنف من ادب اردوية نجده كثير العدد بديع  
الاسلوب لطيف التعبير احسن التشبيهات جيد الوصف ولكن مع كل تلك  
المحاسن نجده خاليا عن التحسر عاريا عن التأثير لان الشعراء ما نظموا تلك  
الاشعار رثاء القريب لهم وانما يتبركون بالمرثية ويرجون ثوابها.

وما عدا هذا الضعف اى عدم التأثير نجد المراثى مملوءة بالاكاذيب  
والباطيل فلا يمكن لذى معرفة ان رجلا من الاعراب فضلا عن رجال قريش  
والهواشم منهم كان يعيش كما يصفونه الشعراء الهنود فاذا نظرنا الى تلك  
الا سقام والعيوب فلا بد لنا ان نقول ان الشعر الرثائى لا يوجد فى الاردوية الا  
الاقل من القليل فانها شميات من المراثى لا يمكن ان تعد فى المراثى فهل بقى  
بعدها شى لان الشائع عندنا باسم المرثية ليس غيرها.

قد يوجد فى هذا الادب الشعر الرثائى بدون اسم المرثية تظهر فيه شدة  
الوجع والتحسر بتمامه فمنها ما انشد الشاعر الهندى الكبير مرزا اسد الله  
خان الشهير بغالب على فجاعة نزلت به. كان الفقيد المدعو بعارف شابا ادبيا  
شاعرا لطيفا وهو ابن اخت لزوجته وما كان غالب رزق بولد فتبناه هو وزوجه و

ربیاء مثل الولد اذ وافاه اجله فمات وترك بعده خالته وزوجها (غالب) و  
 اولاداً صغاراً ففجعوا کلهم واضطربوا فرثاه غالب:  
 لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور  
 کان یجب علیک ان تنتظرنی یوما او ایاما لماذا ارتحلت وحیداً متکراً  
 فعش منفرداً یوما او ایاماً.

اظن هذا الشعر و اخوانه ائمن من مجلدات ضخمة نجدها و افرقة العدد من  
 المراثی فی خزائن الكتب عندنا و اتیقن ان تلك الاشعار مرثیة مولمة مع انها  
 لیست فی قالب معلوم للمراثی عند ارباب الادب.  
 و فی الختام انقل بیت آخر للمرحوم استاذی المفتی لطف تغمده اللہ  
 برحمته انشده رثاء علی فقید کان هو صدیقہ و ابن صدیق له اعنی عبد الماجد  
 القادری البدایونی فانه مات غریب عن الوطن و ما کان تجاوز عن اربعین  
 او کاد و کان خطیباً مسقتعا و شاعراً مجیداً فبکی استاذی المرحوم لانه کان فقد  
 المرحوم عبد القیوم ابا عبد الماجد من قبل و کان صدیقہ الوفی فبعده رضی بالابن  
 بده عن الاب و لکن هذا الحبيب اللیب هجره و اتصل بابیه الشہید رحمہما  
 اللہ فانشد

جانے کو تو جاتا ہے جو آیا ہے عدم سے  
 افسوس تو اس کا ہے یہ پہلے گئے ہم سے  
 ان الذی قدم من العدم فانه یذهب من الدنیا و لکنی متاسف علی انه ذهب  
 قبل ذہابی.  
 و امثال ہذین البیتین نادرة و لکن النادر القلیل یكون ثمینا بل ائمن و فی  
 الزوایا خبایا.



## بِسلسلہ جشن زریں مطبوعات تاج الفحول اکیڈمی

۱	احقاق حق	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۲	عقیدہ شفاعت	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۳	اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۴	اکمال فی بحث شد الرحال	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۵	فصل الخطاب	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۶	حرز معظم	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۷	مولود منظوم مع انتخاب نعت و مناقب	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۸	عظمت غوث اعظم	علامہ محبت احمد قادری بدایونی
۹	سنت مصافحہ	تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
۱۰	الکلام السدید	تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
۱۱	رد روافض	تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
۱۲	تذکرہ فضل رسول	مولانا انوار الحق عثمانی بدایونی
۱۳	مردیے سنتے ہیں	مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی
۱۴	مضامین شہید	مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی
۱۵	ملت اسلامیہ کا ماضی حال مستقبل	مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی
۱۶	عرس کی شرعی حیثیت	مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
۱۷	فلاح دارین	مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
۱۸	خطبات صدارت	عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی
۱۹	مثنوی غوثیہ	عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی
۲۰	عقائد اہل سنت	مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی
۲۱	دعوت عمل	مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی
۲۲	نگارشات محب احمد	علامہ محبت احمد قادری بدایونی
۲۳	تحقیق و تفہیم	مولانا اسید الحق قادری
۲۴	شارحہ الصدور	مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی
۲۵	الدرر السنیة ترجمہ از :	مفتی حبیب الرحمن قادری بدایونی



۲۶ احکام قبور	مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی
۲۷ ریاض القرائت	مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی
۲۸ تذکار محبوب (تذکرہ عاشق الرسول)	مولانا عبد الرحیم قادری بدایونی
۲۹ مختصر سیرت خیر البشر	مولانا محمد عبد الہادی القادری بدایونی
۳۰ احوال و مقامات	مولانا محمد عبد الہادی القادری بدایونی
۳۱ خمیازہ حیات	مولانا محمد عبد الہادی القادری بدایونی
۳۲ باقیات ہادی	مولانا محمد عبد الہادی القادری بدایونی
۳۳ مدینے میں (مجموعہ کلام)	حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری بدایونی
۳۴ مفتی لطف بدایونی	مولانا اسید الحق قادری
۳۵ مولانا فیض احمد بدایونی	پروفیسر محمد ایوب قادری
۳۶ قرآن کریم کی سائنسی تفسیر	مولانا اسید الحق قادری
(ایک تنقیدی مطالعہ)	
۳۷ حدیث افتراق امت تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں	مولانا اسید الحق قادری
۳۸ احادیث قدسیہ	مولانا اسید الحق قادری
۳۹ تذکرہ ماجد	مولانا اسید الحق قادری
۴۰ عقیدہ شفاعت (ہندی)	سیدنا شاہ فضل رسول قادری
۴۱ فلاح دارین (ہندی)	مولانا عبد الماجد قادری بدایونی
۴۲ دعوت عمل (ہندی)	مولانا عبد الماجد قادری بدایونی
۴۳ عقائد اہل سنت (ہندی)	مولانا عبد الماجد قادری بدایونی
۴۴ معراج تخیل (ہندی)	حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری بدایونی
۴۵ مولانا فیض احمد بدایونی (ہندی)	محمد تنویر خان قادری بدایونی
۴۶ پیغمبر اسلام کا مہان ویکتو (ہندی)	محمد تنویر خان قادری بدایونی
۴۷ احادیث قدسیہ (ہندی)	مولانا اسید الحق قادری
۴۸ عقیدہ شفاعت (گجراتی)	سیدنا شاہ فضل رسول قادری
۴۹ Call to Action	Maulana Abdul hamed qadri
۵۰ 100, Hadith Qudsi	Maulana Usaid ul Haq Qadri

